تحرر

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نمبر ۲۲۴

گورکی کی آپ بیتی

جلد سوم

جوانی کے دن

مترجم

جناب ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری
بی اے (علیگ) ڈی لٹ (پیرس)

شائع کردہ

عنوان:

مطبوعہ ہمدرد برقی پریس دہلی۔

سِلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) نمبر ۲۲۴

گورکی کی آپ بیتی

(جلد سوم)

جوانی کے دِن

مترجم

جناب ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری

بی اے (علیگ)، ڈی لٹ (پیرس)

پہلا باب

میری تعلیم گاہیں

غرض کہ میں نے سچ مچ حصولِ تعلیم کے ارادے سے قازان یونی ورسٹی کی راہ لی۔

یہ بات مجھے ایوری نوف نامی خوش مزاج لڑکے نے سمجھائی تھی۔ اس کا ٹکھڑا دِل رُبا تھا اور آنکھوں میں نسوانیت کا رس گھُلا ہُوا۔ ابھی وہ اسکول میں پڑھتا تھا اور ہم دونوں ایک ہی مکان کے بالا خانے میں رہتے تھے۔ اکثر کتاب لیے ٹہلتے دیکھ کر اسے مجھ سے دِل چسپی ہوگئی۔ ہم دونوں میں پینگ بڑھتی گئی اور وہ مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کرنے لگا کہ میرا ذہن سائنس کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔

اپنی لمبی زُلفوں کو بانک پن سے جھٹک کر وہ بولا "تمھیں قدرت نے سائنس کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے"۔

میری جہالت دیکھیے کہ ہنوز یہ بھی نہ معلوم تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو خرگوش کے بدلے اپنے کو قطع و برید کا ہدف بنا کر سائنس کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ ایوری نوف نے حتمی طور پر ثابت کر دکھایا کہ یونی ورسٹی کو صِرف مجھ جیسے لڑکوں ہی کی ضرورت ہے! اگر میں اس کے ساتھ بود و باش اختیار کروں اور چندے اسکول میں حاضری دے کر بعض امتحانات پاس کرلوں —— تو یونی ورسٹی سے مجھے یقیناً وظیفہ مِل جائے گا۔

اور پانچ سال کی مدّت میں میں بی۔ اے پاس کر لوں گا! یہ سب کس قدر آسان تھا ــــــ محض اس لیے کہ ایوری نوف کی عمر صرف اُنیس سال تھی اور اس کے سینے میں جو دِل دھڑکتا تھا وہ مہر و محبّت سے لبریز تھا۔

امتحان دے کر وہ روانہ ہوگیا اور مَیں بھی اس کے نقشِ قدم پر چل کھڑا ہُوا۔

رُخصت کے وقت نانی نے نصیحت کی: " انسانوں سے خفا نہ رہا کرو۔ اگر ہمیشہ دُنیا سے روٹھے رہوگے تو تمھاری طبیعت میں تلخی اور درشتی آجائے گی۔ یہ بات تم میں نانا سے آئی ہے اور دیکھو کہ وہ کس پھٹے حالوں زندگی تیر کر رہے ہیں۔ بڑھاپے کے ساتھ ان کی دانائی کم اور تلخی زیادہ ہوتی گئی۔ یہ سُن رکھو کہ خدا انسانوں کا امتحان نہیں لیتا کیوں کہ یہ شیطان کی کام یابی کا اعتراف ہوگا! اچھا، جہاں رہو، سلامت رہو۔ اب تمھارا دیدار نہ ہوگا۔" نانی کے جھرّی دار گال آنسوؤں سے تر ہوگئے تھے۔ " ارے آوارہ مزاج تو دیس بہ دیس کی خاک چھانتا پھرے گا ــــــ اور میری قبر یہیں بنے گی ــــــ"

تھوڑے عرصے سے مَیں نانی سے بے تعلق ہوگیا تھا۔ لیکن اس وقت میرا دِل یہ سوچ کر رو اٹھا کہ دُنیا میں ایسی بے غرض اور محبوب ہستی سے پھر واسطہ نہ پڑے گا۔

اگن بوٹ کے دنبالے سے مَیں سوگ وار حالت میں نانی کو دیکھتا رہا جو ساحل پر کھڑی ایک ہاتھ سے صلیب کا نشان بنا رہی تھی اور دُوسرے سے شال کا کونہ پکڑ کر اشک فشاں آنکھوں کو پونچھ رہی تھی ــــــ وہ آنکھیں جن میں انسانیت کی محبّت کا نور جگ مگا رہا تھا۔

اب مَیں ایک نیم تاتاری شہر میں آگیا تھا، جہاں جدھر نظر اُٹھائیے صف بہ صف گندی جھونپڑیوں کے سوا کچھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ اسی قسم کے ایک گھر

میں میرا بسیرا تھا۔ اس کی ایک دیوار

جل کر خاک سیاہ ہوگئی تھی اور جنگلی گھاس پھوس میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت کا ہیولا باہر جھانک رہا تھا۔ اس خرابے میں ایک ہوادار تہ خانہ باقی رہ گیا تھا جس میں بازاری کتے مراجیا کرتے تھے۔ میں اس مقام کو کبھی نہ بھولوں گا، کیوں کہ میری تعلیم گاہوں میں ایک یہ بھی تھا۔

ایوری نوف اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کا گزارہ چھوٹی سی پنشن پر تھا۔ وہ غم انگیز نظارہ اب بھی مجھے یاد ہے جب دُکھیا ماں بازار سے نپا تُلا سودا لے کر لوٹتی اور اس فکر میں محو ہوجاتی کہ چار کھانے والوں کے لیے یہ کس طرح بس ہوگا۔

یہ بُڑھیا ہمیشہ چُپ چُپ رہتی تھی۔ اس کی بھُوری آنکھوں سے یہ بات ٹپکتی تھی گویا کوئی گھوڑا محنت سے تھک کر بیزار ہوگیا ہو، پھر بھی اپنا بوجھ اُٹھائے اونچائی پر چڑھ رہا ہو، یہ جانتے ہوئے کہ یہ راستہ کبھی طے نہ ہوگا۔

مجھے آئے ہوئے تین دن ہوئے تھے اور میں صبح سویرے اس کے پاس بیٹھا ترکاری صاف کر رہا تھا۔ دونوں لڑکے گہری نیند سو رہے تھے، اس نے کمال احتیاط سے پوچھا:

"کیوں جی، تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا: "یونی ورسٹی میں پڑھنے۔"

یہ سُن کر اس کی بھوں کمان بن گئی اور ماتھے پر شکن پڑگئی۔ اس کی اُنگلی کٹ گئی اور وہ اپنا لہو چاٹتے ہوئے کُرسی پر نڈھال گر پڑی۔ لیکن پل بھر میں اُچک کر وہ بولی:

"ادی نوج —— تمہیں آلو چھیلنے کا اچھا ڈھنگ آتا ہے" یہ کہہ کر وہ زخمی انگلی پر ایک دھجی لپیٹنے لگی۔

"یہ بھی نہ آئے تو مجھ پر تُف ہے!" میں نے اسے سُنایا کہ اگن بوٹ پر میں کس خدمت پر مامور تھا۔

جواب میں اس نے پوچھا: "تم سمجھتے ہو کہ یہ تجربہ یونی ورسٹی میں داخلے کے لیے کافی ہوگا؟"

اس وقت مجھے مذاق سمجھنے کا سلیقہ نہ تھا۔ نہایت سنجیدگی سے اسے میں نے اپنے مبلغ علم کی روے داد سُنائی اور سمجھایا کہ سائنس کے دریچے بہت جلد میرے لیے کُھلنے والے ہیں۔

ایک ٹھنڈا سانس بھر کر اس نے صرف اتنا کہا: "واہ رے نکولائی!" یہ میرے دوست کا پیار کا نام تھا۔

اسی وقت نکولائی نیم خوابی کی حالت میں کُلّی کرنے باورچی خانے آیا۔ حسبِ عادت وہ اس فاقہ مستی میں بھی مگن تھا۔

"امّاں، آج تو پسندے کِھلواؤ"

"تمھارا جی چاہتا ہے تو یہی سہی"

اپنی خوش خوراکی کے مظاہرے کے لیے میں کہہ اُٹھا کہ یہ گوشت نہ پسندوں کے لیے کافی ہے اور نہ مناسب۔

یہ کہنا تھا کہ بڑھیا ہتّے سے اُکھڑ گئی اور مجھے وہ جلی کٹی سُنائی کہ شرم سے میرا چہرہ تمتما گیا۔ میز پر گاجر پٹک کر وہ یہ جا وہ جا باہر چلی گئی اور نکولائی نے اشارے سے کہا کہ آج بڑھیا کا مزاج خراب ہے۔ وہ مجھے سائنس کے نظریے سے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ عورتوں کو مردوں کی بہ نسبت

جلدی غصہ آتا ہے۔

نکولائی ہر آن میری تعلیم کی جستجو میں رہتا اور موقع بے موقع کوئی نہ کوئی علمی نکتہ میرے دماغ میں ٹھونس دیتا۔ میں بھی بڑے اشتیاق سے اس کی باتیں سنتا اور کچھ دنوں بعد دُنیا کے سب فلسفی اور سائنس داں میرے تخیل میں ایک دیو ہیکل کی شکل میں سما گئے۔ یہ نیک دِل لڑکا مجھے انسان بنانے کی دُھن میں رہتا تھا۔ لیکن نہ تو اس کے پاس اتنی فرصت تھی اور نہ اتنی صلاحیت۔ خود پسندی اور لاپروائی کی وجہ سے اسے اس امر کا مطلق احساس نہ تھا کہ گزر اوقات کے لیے بے چاری ماں کو کتنی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اس کا کُند ذہن بھائی تو اس قسم کے احساس سے قطعاً عاری تھا۔ لیکن میں خوب سمجھ رہا تھا کہ باورچی خانے میں کیمیا اور اقتصادیات کے کیسے کٹھن تجربے ہو رہے ہیں۔ اور بڑھیا کس مشکل سے اپنے بیٹوں کا پیٹ کاٹ کر مجھ جیسے بے گھرے ہڑدنگے کا دوزخ بھرتی ہے۔ چناں چہ ہر لقمہ میرے گلے میں اٹکتا اور سینے میں پتھر کی طرح اڑا رہتا تھا۔ مجبوراً میں روزی کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگا۔ صبح ہوتے ہی میں گھر سے چلا جاتا تاکہ دوپہر کا کھانا نہ کھانا پڑے۔ موسم خراب ہوتا تو اس تہ خانے میں پناہ لیتا۔ وہاں کتّوں اور بلیوں کی سڑی لاشوں کے بیچ میں بیٹھے بیٹھے اور باد و باراں کی سرگوشیوں کو سنتے ہوئے مجھے یقین ہو چلا کہ یونی ورسٹی میرے لیے نہیں۔ اچھا ہوتا یہاں نہ آتا اور ایران چلا جاتا۔ کبھی کبھی تصوّر مجھے ایک ڈھیل ڈول جادوگر بنا کر رکھلاتا جو سیب سے بڑے خوشۂ گندم اور آدھ من وزنی آلو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ اس جادوگر نے دُنیا کی آسائش کے لیے کئی ایجادیں کی تھیں، کیوں کہ یہ دُنیا میرے اور مجھ جیسے اَن گنت آدمیوں کے

لیے جہنم سے بھی بدتر تھی۔

اپنی خیالی دُنیا میں مَیں بڑے بڑے کارناموں کا ہیرو بن گیا۔ اور زندگی کی کٹھن گھڑیوں میں —— جن کی مدت بہت طویل تھی —— یہ خام خیالی میرے بہت کام آئی۔ اس زمانے میں مَیں عموماً اس خیالی دُنیا میں رہنے لگا۔ کسی کی دستگیری اور اپنی خوش بختی کی امید نہ تھی۔ اس لیے رفتہ رفتہ میری قوتِ ارادی مضبوط ہوتی گئی۔ اور مشکلات کے اضافے کے وقت مَیں نے اسی کا سہارا لیا اور اس نے مجھے ہمت و عقل دونوں سے سرفراز کیا۔ کم عمری ہی میں یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوگئی کہ انسان کا کردار ماحول کا مقابلہ کرتے وقت بنتا ہے۔

فاقے سے بچنے کے لیے مَیں دریائے وولگا کی کشتیوں کے اِرد گرد منڈلانے لگا کیوں کہ اس جگہ چار چھ آنے آسانی سے کمائے جا سکتے تھے۔ وہاں جہازیوں، ماہی گیروں اور بھانت بھانت کے آوارہ گردوں میں رہتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مَیں لوہے کی سلاخ ہوں جسے دہکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا گیا ہے۔ ہر روز تند و تلخ تاثرات میرے قلب میں ہیجان پیدا کیا کرتے کیوں کہ میرے آگے ایسے جان داروں کا انبوہ تھا جو ہر قسم کی کمینگی سے آلودہ تھے لیکن زندگی سے ان کی دُشمنی، دُنیا سے ان کی حقارت آمیز عداوت اور اپنے معاملات سے ان کی بے نیازی مجھے ازبس پسند تھی۔ میرا ماضی مجھے ان کی طرف کھینچتا تھا اور اس کا حکم تھا کہ مَیں اسی گرداب میں کود پڑوں۔ ان کی زندگی سے مجھے ہمدردی تھی اور اس کی بنیاد سستے ناولوں کا مطالعہ نہیں بلکہ اپنا مشاہدہ تھا۔

بشکون جو کسی زمانے میں ٹریننگ کالج میں پڑھتے پڑھتے پرلے درجے

کا چور بن گیا اور اس جُرم میں بُری طرح پِٹ چکا تھا، اب تپ دق کا مریض تھا وہ اپنی ساری جادو بیانی مجھ پر صرف کیا کرتا تھا: "میاں صاحب زادے، تم کنواری لڑکیوں کی طرح شرم و حیا کو کیوں دامن گیر رکھتے ہو؟ کیا تمھیں عزّت جانے کا کھٹکا ہے؟ بھائی، عزّت آب رُو تو عورت کا سرمایہ ہے، مرد کے لیے اسے گدھے کا بوجھ جانو۔ اگر بیل ایمان دار ہے تو سمجھ لو کہ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے!"

ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ اور لال بالوں والے بشکن پر کسی ایکٹر کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے ہلکے پھلکے بدن کی چٹک مٹک باگڑ بلّوں کی سی کی تھی۔ وہ مجھ سے اُستاد اور سرپرست کا سا برتاؤ کرتا تھا۔ اور خلوصِ دل سے میری خوشی اور بہبودی کا خواہاں تھا۔ وہ بلا کا ذہین تھا اور بہت کتابیں پڑھ چکا تھا جس میں اسے ڈیوما کا مقبول ناول 'موتیوں کا خزانہ' سب سے زیادہ پسند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس کتاب کی اپنی رُوح ہے۔ عورتوں پر اس کی جان جاتی تھی اور ان کا ذِکر وہ نہایت ذوق و شوق سے کیا کرتا۔ اس وقت اس کی زبان سے چٹخارے کی آواز نکلتی اور اس کا ٹیڑھا بینگا جسم ایسے پیچ و خم کھانے لگتا کہ مجھے کراہت ہونے لگتی مگر اس کے بول جادو بھرے تھے اور میں انھیں کان لگا کر سُنتا تھا۔

"عورت! عورت!" یہ منتر جپتے وقت اس کی پیلی رنگت سُرخی مائل ہو جاتی اور کالی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ "عورت کے لیے میں آسمان کے تارے توڑ لاؤں۔ شیطان اور عورت کے لیے سب گناہ معاف ہیں محبت کی زندگی سے زیادہ حسین اور کون سی شے ہے۔"

اسے قدرت نے داستان گو بنایا تھا اور وہ ناکام محبت کے جذبات

طوائفوں کے لیے گیت کی مالا میں فوراً پرو دیتا۔ دریائے وولگا کے کنارے کی ہر بستی میں اس کے بنائے ہوئے گیت گائے جاتے تھے۔

تروسوف نامی شکیل جوان بھی میرا یارِ غار تھا۔ وہ ہمیشہ سجا بنا رہتا اور گو اُس کی دُکان پر "گھڑی ساز" کا بورڈ ٹنکا ہوا تھا لیکن دراصل وہ چوری کا مال بیچتا تھا۔

اپنی ڈاڑھی کو سُلجھاتے اور چالاک آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے وہ نصیحت کرتا: "میکسم، چوری کی عادت نہ ڈالو۔ تمھارا راستہ الگ ہے کیوں کہ تم طبعاً روحانیت پرور ہو۔"

"اس سے کیا مطلب؟"

"یہ کہ تم میں حسد کا نام نہیں، صرف تجسّس ہی تجسّس ہے۔"

میرے بارے میں اس نے غلط رائے قائم کی تھی کیوں کہ میں سو فی صدی حاسد تھا۔ اور تو اور بشکن کے اندازِ بیان پر بھی میں رشک کرتا تھا کیوں کہ اسے تشبیہہ اور محاورے پر خداداد قدرت تھی۔ ایک داستانِ محبت کا آغاز اس نے جس پیرائے میں کیا وہ مجھے خوب یاد ہے:

"لیلائے شب اپنا ساز چھیڑ چکی تھی اور میں فلاں ویران شہر میں من مارے یوں بیٹھا تھا گویا کسی سوکھے ٹھنٹھ پر ایک چغد بسیرا کر رہا ہو۔ یہ پت جھڑ کا موسم تھا۔ مینھ کی بوندوں اور ہوا کے جھونکوں سے ایسی اُداس راگنی نکل رہی تھی گویا کوئی بدبخت تاتاری دھرپد الاپ رہا ہو ———

اور اسی گھڑی وہ جانِ جہاں آئی جو اس درجہ سبک خرام تھی گویا جھٹپٹے کی گلابی بدلی۔ اس کی نگاہوں میں پُرفریب معصومیت تیر رہی تھی۔ اس کی رس بھری آواز نے کہا: پیارے، اب تو مجھے بے وفا نہ کہو گے؟ میں جانتا

اس کے دروغ۔ پر اور دل کو اس کی صداقت پر اعتبار تھا۔

کہانی کہتے وقت وہ جھومنے لگتا تھا۔ روشنی سے پردہ کرنے کے لیے وہ آنکھ کو ہاتھ سے ڈھک لیتا اور کبھی کبھی کلیجہ مسوسنے لگتا۔ اس کی آواز بھاری تھی لیکن اس کی گفتگو بلبل کے ترانے سے زیادہ شیریں تھی۔

تردسوف پر بھی مجھے رشک آتا تھا کیوں کہ وہ سائبیریا، جنیوا اور اور بخارا کے حالات بہت دِل چسپ انداز میں سُناتا اور پادریوں کا نام آتے ہی وہ صلواتیں سُناتا کہ توبہ۔

تردسوف ناٹک کے اس جلاد کی طرح تھا جو آخر میں یک بہ یک چولا بدل کر نیک دل ہیرو بن گیا ہو اور اس قلبِ ماہیت پر ناظرین کے اچنبھے کی حد نہ رہی ہو۔

کبھی کبھی یہ دونوں بھلے مانس اور دوستوں کے ساتھ ندی پار نکل جاتے اور کچھ وقت پیڑوں کے جھنڈ میں گزارتے۔ کھانا پینا ختم کر کے پیڑوں کے نیچے لیٹے لیٹے وہ نجی معاملات یا دُنیا کے جھمیلوں پر فلسفہ بگھارا کرتے۔ ان کی گفتگو کا مرکز اکثر عورت کی ذات قرار پاتی۔ اور اس وقت وہ غم و غصّے کی حالت میں ہوتے۔ اس میں رقّت کا بھی تھوڑا سا پہلو تھا۔ ان کی حالت ایسے آدمیوں کی ہوتی جو کسی اندھیری کوٹھری میں جھانک رہے ہوں جس میں کسی طلسم کا دروازہ کھلتا ہو۔ مَیں نے ان کے ساتھ دو تین راتیں آسمان تلے ایک تپتے ہوئے میدان میں بسر کیں۔ ندی کنارے کی نم ناک تاریکی میں بجروں کی مشعلیں سنہری مکڑیوں کی طرح اپنا تانا بانا بُنا کرتیں۔ اور دیہاتی مکانوں کی جھلملیوں سے روشنی کی کرنیں آتشیں رگوں کی طرح چمک اُٹھتیں۔

اگن بوٹ کے پہیئے پانی میں گردش کرتے اور بجرے کے کھیون ہار تھکن کے مارے بھیڑیوں کی طرح غرّانے لگتے ۔ کہیں لوہے پر ہتوڑے کی ضرب سُنائی دیتی کہیں کوئی دردبھری تان اندھیرے میں بکھیر دیتا ۔ اسے سُن کر رُوح پر اُداسی سی چھا جاتی اور دِل پر گویا گرم گرم سی راکھ اُڑنے لگتی ۔

لیکن اس سے زیادہ افسوس مجھے اس بات چیت کو سُن کر ہوتا جو میرے ساتھی آپس میں آہستہ آہستہ کیا کرتے تھے ۔ ان میں سے ہر ایک اپنی رام کہانی سُناتا اور دُوسروں کی بات پر دھیان نہ دیتا تھا ۔ درختوں کے سایے میں پڑے کبھی وہ سگریٹ کے کش کھینچتے اور کبھی شراب کے گھونٹ پیتے ۔ ایسے موقعوں پر ان کی یادداشت کے دفتر کھُل جاتے تھے ۔

زمین پر پڑے پڑے کوئی اندھیرے میں آنکھ پھاڑ کر بول اُٹھتا : "ایک بار مجھ پر جو بیتی وہ سُناتا ہوں ——— "

یہ واردات سُن کر سب لوگ بہ یک آواز کہتے : " میاں بھئی ، دُنیا اسی کا نام ہے ۔"

ان کا ہر جملہ 'تھا' اور 'تھی' پر ختم ہوتا تھا ۔ گویا سب کچھ ماضی میں تھا ، مستقبل کوئی چیز نہ تھا ۔ بس یہ معلوم ہوتا کہ یہ ان کی زندگی کی آخری رات ہے ۔

بشکن اور تردسوف کی یہ ماضی پرستی مجھے سخت ناگوار تھی پھر بھی مجھے ان سے اُنس تھا ۔ یہی نہیں کہ یہ حالات کا تقاضا تھا ، بلکہ خدا جانے کیوں مجھے یہ اُمید بندھ چلی تھی کہ ان کے ساتھ رہنے سے میری زندگی سُدھر جائے گی اور تعلیم کا کوئی راستہ نکل آئے گا ۔ بھوک ، غصّے اور بیزاری کی حالت میں مجھ سے ہر قسم کے جُرم کا ارتکاب ممکن تھا ۔ اس وقت دُوسروں کے دھن مال کا

"تقدس" بھی مجھے یاد نہ رہتا تھا۔ ان خطرات
چیز نے مجھے روکا وہ شباب کا رومان تھا۔ اسی نے مجھے اپنی اصل راہ پر ثابت قدم رکھا۔ کئی بھلے بُرے ناولوں کے علاوہ اب مَیں بہت سی سنجیدہ کتابیں بھی پڑھ چکا تھا۔ اور انھوں نے مجھ میں کسی ناقابلِ بیان شے کی تلاش کا احساس پیدا کردیا۔

ساتھ ساتھ میرے احباب اور تاثرات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اسکول کے لڑکے ایوری نوف کے گھر کے پاس کے ویرانے میں کھیل کود کے لیے جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک 'گوری پلیٹ نف' نامی مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ اس کے بال جاپانیوں کے سے تھے اور چہرے پر اتنے تل تھے جیسے کسی نے بارود بکھیر دی ہو۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور کھلنڈرا تو تھا ہی، حاضر جوابی میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس میں ترقی کے بہت سے امکانات تھے لیکن تمام باکمال روسیوں کی طرح وہ قدرت کے عطیے پر قانع تھا اور اس میں اضافے کی کوئی کوشش نہ کرتا تھا۔ اسے موسیقی کا نہایت اچھا ذوق تھا اور وہ خود معمولی سازوں کو بجا سکتا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی میں کمال حاصل کرنے کی کوشش اس نے نہ کی۔ وہ غریب تھا اور اس کے کپڑوں میں جا بجا پیوند لگے ہوئے۔ لیکن شاید اس کی آزاد منشی اور آوارہ مزاجی کے لیے یہی لباس موزوں تھا۔

اس پر کسی ایسے آدمی کا گمان ہوتا جو طویل بیماری کے بعد ابھی پلنگ سے اٹھا ہو یا لمبی سزا کاٹ کر ابھی جیل سے چھوٹا ہو۔ دُنیا کی ہر شے اس کے لیے مسرت کی پیامی تھی۔ اور جوش و ولولے کے عالم میں وہ ہر وقت ایسا چاق چوبند رہتا گویا کوئی آتش پارہ فضا میں چکر لگا رہا ہو۔

میرا حال سُن کر اس نے کہا کہ آؤ مِل کر ساتھ رہیں اور تم دیہاتی اسکول

کے ماسٹر کی سند حاصل کرو۔ چناں چہ میں ایک عجیب وغریب مکان میں جاکر رہنے لگا جس میں خستہ حال طلبہ کے علاوہ طوائفوں اور جرائم پیشہ حضرات کا مسکن تھا۔ اس مکان کی ظاہری شکل صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم اس پر زبردستی قابض ہوگئے ہیں۔ ہماری کوٹھری اوپر کی سیڑھی کے سائے میں تھی۔ میرے دوست کا کُل سرمایہ ایک ایک عدد پلنگ، کرسی، اور میز پر مشتمل۔ اس غلام گردش کی تین کوٹھریوں میں سے دو میں طوائفیں رہتی تھیں۔ اور تیسری میں ایک لمبا تڑنگا لیکن مدقوق حساب داں۔ جس کے پھٹے ہوئے میلے کپڑوں سے جسم کی ہڈیاں صاف جھلکتی رہتی تھیں۔

کوئی دیکھتا تو کہتا کہ یہ بندۂ خدا صرف اپنے ناخونوں کو چاٹ کر زندہ ہے۔ صبح سے شام تک وہ حساب کے سوال حل کرتا اور اس دوران میں برابر کھانستا جاتا۔ اپنے ناخونوں میں کبھی وہ اس زور سے دانت پیوست کرتا کہ وہ لہولہان ہوجاتے۔ طوائفیں اس کے سائے سے دور بھاگتی تھیں اور اسے مجنوں گردانتی تھیں۔ تو بھی ترس کھاکر اس کے دروازے پر چائے اور روٹی رکھ جاتی تھیں۔ انھیں اُٹھاتے وقت حساب داں تھکے ہارے گھوڑے کی طرح خرخرایا کرتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے وہ یہ ہدیۂ عقیدت پیش کرنا بھول جاتیں تو وہ دروازہ کھول کر بھرّائی ہوئی آواز میں "روٹی" کے نعروں سے فلک میں شگاف ڈال دیتا تھا۔

اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو ان خبطیوں کی نشانی ہے جو اپنے بڑے پن کے احساس میں مگن رہتے ہیں۔ اس سے ملنے کے لیے کبھی کبھی ایک لنگڑا کُبڑا آیا کرتا تھا۔ اس کی پھولی ہوئی ناک پر موٹی سی عینک جلوہ گر ہوتی اور زخموں کی سی پیلی صورت پر عیارانہ تبسم عیاں

ہوتا۔ بند دروازے کے اندر وہ دونوں گھنٹوں چُپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ صرف ایک بار رات گئے حساب داں کی اس دہشت انگیز پکار نے مجھے جگا دیا:

"مَیں کہتا ہوں کہ یہ قید خانہ ہے! جیومیٹری کی حیثیت ایک چوہے دانی یا پنجرے سے زیادہ نہیں۔"

جانے وہ کون سا عجیب لفظ تھا جسے کُبڑا لگاتار دہراتا گیا۔ اور اچانک حساب داں نے بگڑ کر کہا:

"تجھ پر خدا کی لعنت! نکل میرے گھر سے!"

مہمان کو رخصت کر کے وہ سیڑھی پر قہر و غضب کے عالم میں آ کھڑا ہوا ایک ہاتھ سے لبادہ اوڑھتے اور دوسرے سے ڈاڑھی سلجھاتے ہوئے وہ کوئی جن معلوم ہو رہا تھا۔ غصّے کے مارے وہ چلّانے لگا:

"اقلیدس اُلّو کا پٹھا تھا! مَیں ثابت کر دکھاؤں گا کہ خدا اس یونانی کے بچّے سے زیادہ عاقل ہے۔"

اس نے اس زور سے دروازہ بند کیا کہ دھماکے سے کمرے کی کوئی چیز زناتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔

اس کے بعد مَیں نے سُنا کہ وہ ریاضیات کے اصول پر خدا کا وجود ثابت کرنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ مر گیا۔

میرا دوست گوری پلیٹ نف ایک چھاپے خانے میں چوّنی اجرت پر رات کو اخبار کے پروف دیکھا کرتا تھا۔ کسی روز مجھے کچھ نہ ملتا تو ہم دوّنی کی روٹی، اِکنّی کی چائے اور اِکنّی کی شکر پر قناعت کر لیتے۔ میرا سارا وقت پڑھائی میں چلا جاتا۔ اور اس کے لیے بڑا پتّا مارنا پڑتا۔ خصوصاً گرامر میرے لیے وبالِ جان تھی۔ روسی زبان کی فطری سیماب وشی گرامر کی حدبندیوں میں آ کر

مجھے بے حُسن نظر آتی تھی۔ طرفہ یہ کہ اب جاکر معلوم ہوا کہ اسکول ماسٹر کی سند کے لیے مَیں ابھی کم عمر ہوں۔ اور اگر یہ امتحان پاس بھی کروں تو فی الحال ملازمت نہ مِلے گی۔

ہم دونوں کے پاس ایک پلنگ تھا، جس پر مَیں رات کو اور گوری دِن کو سویا کرتا تھا۔ رات بھر کام کرکے صبح سویرے جب وہ تھکا ہارا لوٹتا تو اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی ہوتیں۔ ہمارے پاس چائے بنانے کے لیے کوئی سماوار نہ تھا۔ اس لیے مَیں گرم پانی کے لیے بھاگا ہُوا بھٹیار خانے جاتا۔ چائے کے وقت گوری اخبار کی دِل چسپ خبروں کے ساتھ ذکاہی اشعار سُنایا کرتا اور اس کی اس زندہ دِلی پر مجھے سخت حیرت ہوتی۔

زندگی کے متعلق یہی ظریفانہ نظریہ 'گلکینا' نامی کٹنی کا تھا جو عورتوں کے پھٹے پُرانے کپڑے بیچا کرتی تھی۔ گوری نے اسی سے کوٹھری کرائے پر لی تھی۔ لیکن کیوں کہ روپیوں کی صورت میں کرائے کی ادائیگی ناممکن تھی۔ اس لیے وہ بُڑھیا کو چٹکلے سُنا کر ہارمونکا بجاکر اور گیت گاکر خوش کرتا تھا۔ اپنی جوانی میں گل کینا کسی اوپیرا میں سہیلی کا پارٹ کرتی تھی اور ان گیتوں کی دُھن اسے اب تک یاد تھی۔ انھیں سُن کر اس شرابی اور پیٹو عورت کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں اور ٹھوڑی سے گالوں پر آنسو بہنے لگتے۔ ایک آہ بھرکر پہلے وہ میلی انگلیوں سے آنسو پونچھتی اور پھر اُنگلیوں کو ایک گندے رومال سے صاف کرتی تھی "گوری، خدا کی قسم تو آرٹسٹ ہے! کاش تیری شکل کچھ بھی بہتر ہوتی تو مَیں تجھے مالامال کردیتی۔ ارے، کتنے لڑکے جو تنہائی سے بیزار ہوگئے تھے، آج امیرزادیوں کے آغوش میں پڑے مجھے دُعا دیتے ہیں۔"

ان میں سے ایک دعاگو اسی مکان کی بالائی منزل پر رہتا تھا۔ یہ

طالب علم ایک خمور فروش کا بیٹا تھا۔ کیٹہ قد اور ایک ...
پتلے جیسے ایک مثلث اُلٹا ٹانگ دیا گیا ہو۔ سر اور پیر چھوٹے۔ اور پھیکے شلغم کا سا سفید چہرا جس میں بڑی بڑی ہری آنکھیں جڑی ہوئی تھیں۔ باپ کی مرضی کے خلاف بڑی مشکلوں سے اسکول کی پڑھائی ختم کرکے اب وہ یونی ورسٹی میں داخل ہوگیا تھا۔ وہاں جاکر اسے اپنی پاٹ دار آواز کی خوبیوں کا اندازہ ہوا اور وہ گویّا بننے کے خبط میں مبتلا ہوگیا۔ گل کینا نے اس کی سرپرستی قبول کی اور اس کا یارانہ ایک سوداگر کی بیوی سے کرادیا جس کی عمر چالیس سے کم نہ ہوگی کیوں کہ اس کا بیٹا یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا اور لڑکی اسکول کا درس ختم کرچکی تھی۔ یہ فاحشہ صندوق سینہ سپاہی کی طرح تنی ہوئی تھی۔ امچور سا سوکھا چہرہ جس کے کونوں میں بھوری آنکھیں دھنسی ہوئیں، سیاہ لباس پر ریشم کی پرانی ٹوپی اور کانوں میں زہر کی رنگت کے ہرے پتھر جھولتے ہوئے۔

شام کے اندھیرے یا صبح کے دھندلکے میں وہ اپنے یار سے ملنے آتی تھی۔ میں نے کئی بار آنگن میں اسے لپ جھپ جاتے دیکھا۔ وہ یقیناً پھاٹک اُلانگھ کر اندر آتی تھی۔ ایسے موقعوں پر اس کی شکل دیکھ کر ہیبت ہوتی تھی۔ ہونٹ بھنچے ہوئے، آنکھیں اس طرح پھٹی ہوئی گویا وہ موت کے منھ میں جارہی ہو یا یک بہ یک دیدے پھوٹ گئے ہوں۔ وہ ٹیڑھی بینگی نہ تھی، پھر بھی معلوم نہیں کیوں یہ احساس ہوتا کہ اس کے جسم کا کوئی اسپرنگ ڈھیلا پڑگیا ہے جو اس کے کل پرزوں کو منتشر کررہا ہے۔

گوری کہہ پڑتا: "بھئی ہو نہ ہو یہ پگلی ہے!"

طالب علم کو اس سیٹھنی سے نفرت تھی اور اسے دیکھتے ہی وہ چمپت

ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ سود خوار یا جاسوس کی طرح اس کے پیچھے لگ جاتی تھی۔

وہ بے چارا ہار مان کر ہم سے کہتا: "میں آپ اپنی نظر میں ذلیل ہو چکا ہوں۔ گیت کس کے لیے گاؤں؟ اس شکل اور جسم کو دیکھ کوئی مجھے اسٹیج کے پاس پھٹکنے بھی نہ دے گا۔"

گوری ڈانٹ کر کہتا: "ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔"

"پھر بھی مجھے اس ڈاین پر رحم آتا ہے، اس کی صورت سے مجھے گھن ہے لیکن کیا کروں کہ اس پر ترس آتا ہے۔ تم کیا جانو کہ وہ کیا کیا۔"

ہمیں اس کا تھوڑا سا اندازہ تھا۔ کیوں کہ راتوں کو ہم نے اسے سیڑھی پر کھڑے التجا کرتے سنا تھا:

"پیارے۔ خدا کا واسطہ، للہ آجا۔"

وہ ایک بڑے کارخانے کی مالک تھی۔ ایک حویلی میں ٹھسّے سے رہتی تھی اس کے پاس ٹم ٹم بھی تھی اور زنانہ اسکولوں کو ہزاروں روپے چندہ دیتی تھی۔ لیکن بھکارن کی طرح اس لڑکے کے ایک بوسے کی طلب گار رہتی تھی۔

صبح کی چائے کے بعد گوری پڑ کر سو رہتا، اور میں کام کی تلاش میں باہر چلا جاتا۔ واپسی شام کے وقت ہوتی جب گوری کے چھاپے خانے جانے کا وقت ہو جاتا۔ اگر اتّفاق سے میں کھانے کے لیے کچھ لے آتا تو دونوں برابر کا حصّہ لگا لیتے۔

اس کے بعد میں اس مکان کا معائنہ شروع کرتا جس میں بھول بھلیاں کے لیے لاتعداد پیچ و خم تھے اور سیکڑوں اَن جان آدمی چیونٹیوں کی طرح رہتے تھے۔ ہر طرف سے انواع و اقسام کی بدبوؤں کی لپٹیں اُٹھتیں اور کئی

مشتبہ قِسم کے انسان اِدھر اُدھر گردش کرتے نظر آتے تھے۔ صبح سے آدھی رات تک ایک عجیب قِسم کا شور جاری رہتا۔ کہیں وزن مشین پر کپڑا سی رہی ہے کہیں ناٹک والیاں گیت یاد کر رہی ہیں۔ اُدھر کوئی طالب علم بے سُری تان چھیڑ رہا ہے۔ یہاں ایک ایکٹر شراب کے نشے میں بہ آواز بلند تقریر کر رہا ہے۔ وہاں نشے میں مست طوائفیں آئیں بائیں شائیں بک رہی ہیں۔ یہ سب دیکھ اور سُن کر میرے دل میں یہ لاینحل سوال اُٹھتا:

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ایک سُرخ ریش گنجا توند پُھلائے تھوتھنی پھیلائے اپنی قینچی سی ٹانگوں پر ہر طرف اُچکتا پھرتا تھا۔ اسے سب لوگ 'بارہ راسی' کہتے تھے کیوں کہ اس کا منھ گھوڑوں کا سا تھا۔ دو سال سے وہ اپنے امیر رشتے داروں سے مقدمے بازی میں مصروف تھا، اور علی الاعلان کہتا کہ:

" یا تو مَیں جان دے دوں گا اور یا ان کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ وہ بھیک مانگتے پھریں گے اور مَیں تین سال تک انھیں خیرات کی روٹی کھلاؤں گا۔ پھر مَیں ساری جایداد انھیں لوٹا دوں گا اور پوچھوں گا: کیوں میاں، اب تو چھٹی کا دُودھ یاد آگیا نہ؟"

سب لوگ پُوچھتے: "ہمارے اسپ تازی نے اپنی زندگی کا کیا یہی مقصد قرار دیا ہے؟"

وہ نہایت سادہ لوحی سے کہتا: "اس کے سوا مَیں نہ کچھ کرنا چاہتا ہوں اور نہ کر سکتا ہوں۔"

منصفوں یا وکیلوں کے ساتھ دِن گزار کر شام کے وقت وہ بوتلوں اور پلندوں کے ساتھ ٹانگے پر لدا پھندا آتا اور اپنے تنگ و تاریک کمرے میں جشن

آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔

سوداگر کی بیوی کے بدبخت یار نے زیرِلب کہا: "یہ جادو ہی!"

گوری بڑا من موجی آدمی تھا۔ اور ان عجیب الخلقت ہم نشینوں میں اس کی حیثیت اس ستارے کی سی تھی جو بادل بھرے آسمان میں اکیلا چمکتا رہتا ہی۔ اس کی معصوم رُوح نے جوانی کا خوش رنگ لباس پہن رکھا تھا اور وہ اپنے تاریک ماحول کو ہنسی کھیل سے اُجال دیتا تھا۔ اِس پر پھبتی کہی، اُسے چٹکلا سُنایا، کسی کی نقل اُتاری۔ سماج کی بے انصافی پر وہ دلیری اور صاف گوئی سے تنقید کرتا تھا۔ اور گو اس کی عمر صِرف انیس سال تھی لیکن مکان کا ہر آدمی دُکھ سُکھ میں اس سے مشورہ لیتا۔ اور وہ سب کی مدد کے لیے بے دریغ تیار رہتا تھا۔ اچھے اس کی عزّت کرتے اور بُرے اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ حتا کہ پولیس کا خرّانٹ گرگا دنک فورچ، بھی اس کا لوہا مانتا تھا۔

ہمارے مکان کا صدر پھاٹک ایک بڑے چوک پر کھُلتا تھا۔ اور اسی کے پاس اس پولیس والے کی چوکی تھی۔

وہ محلّے کا سب سے پُرانا کانسٹبل تھا۔ ڈیل میں لمبا، ڈول میں دُبلا۔ چہرے پر ذہانت، ہونٹوں پر دِل کش تبسّم اور آنکھوں میں مکّاری۔ اس کا سینہ تمغوں کے بار سے لدا رہتا تھا۔

ہمارے ہنگامہ خیز مکان سے اسے خاص دِل چسپی تھی، جہاں ماضی و مستقبل کے پیشوا آپس میں مِل جل کر رہتے تھے۔ دِن میں کئی بار وہ ہمارے آنگن میں چہل قدمی کرنے آتا اور کھڑکیوں کو اس غور سے گھورتا گویا چڑیا گھر کا منتظم جنگلی جانوروں کے پنجروں کا معائنہ کر رہا ہو۔ شاید اسی چہل قدمی کا نتیجہ تھا کہ موسمِ سرما میں ہمارے دو پڑوسی جو کبھی فوج میں رہ چکے تھے گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے

بعد یکے بعد دیگرے پانچ آدمی ایک خفیہ چھاپا خانہ قائم کرنے کے جرم میں پکڑے گئے۔ ان کی ٹوہ ان فوجیوں کے تعاقب سے ملی تھی۔ اس کے بعد اسی مکان کا ایک باشندہ پولیس کا شکار ہوا۔ یہ خبر سنتے ہی گوری حیران پریشان رہ گیا۔ غصے کی حالت میں تک جھک کرتے ہوئے ▪ بولا: "میکسم، تم فوراً یہ پیغام لے جاؤ، لیکن احتیاط سے کام لینا کیوں کہ وہاں جاسوس منڈلا رہے ہوں تو عجب نہیں۔" مجھے اس نے اس مقام کا پتا سمجھایا جہاں جانا تھا۔

میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا کیوں کہ پہلی مرتبہ ایک پُراسرار خدمت میرے سپرد کی گئی تھی۔ جب میں اس جگہ پہنچا تو ایک نوجوان کو قلعی کرتے پایا حالاں کہ شکل صورت سے اسے مزدوری سے دور کا واسطہ بھی نہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی کے پاس اُترتی عمر کا ایک آدمی لوہا پیٹ رہا تھا۔

میں نے پوچھا: "کیا کوئی کام ہے؟"

بوڑھے نے جھلا کر کہا: "کام بہت ہے —— پر تم جیسوں کے لیے نہیں۔"

نوجوان نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ موقع دیکھ کر میں نے پیر سے اسے گدگدایا اور اس حرکت پر اسے ایسا طیش آیا کہ شاید مجھے ایک دھول جما دیتا۔ لیکن پھر میرے اشارے کو سمجھ کر اس نے نرمی سے کہا:

"جاؤ بھئی، سر نہ کھاؤ۔"

باہر جا کر میں سڑک پر اس کا انتظار کرنے لگا۔ پل بھر بعد وہ بھی دروازے سے نکلا اور سگریٹ سلگا کر مجھے گھورنے لگا۔

"کیا تمھارا نام تخون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہے تو سہی"

"پیٹر گرفتار ہوگیا۔"

اس نے مجھے تیکھی چتون سے دیکھا اور ناک بھوں چڑھا کر کہا:

"کون سا پیٹر؟"

"وہی جو لمبا اور ڈبلا سا تھا اور دیکھنے میں پادری معلوم ہوتا تھا۔"

"اور کوئی بات؟"

"بس یہی کہنا تھا۔"

"لیکن مجھے پیٹر سے کیا واسطہ؟" اس کی گفتگو کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ وہ مزدور نہیں ہے۔ اور میں اُلٹے پانو گھر لوٹ آیا۔ یہ خدمت انجام دے کر مجھے بڑی مسرت ہوئی، کیوں کہ انقلابی تحریک سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

اس قسم کی سازشوں میں گوری کا ہاتھ ہوتا تھا۔ لیکن میری پوچھ پاچھ کے جواب میں وہ بس یہ کہ کر رہ جاتا کہ:

"جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ ابھی تمھیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

ایوری نوف نے میرا تعارف ایک پُر اسرار شخصیت سے کرایا۔ اور اس سلسلے میں اتنی احتیاط کی کہ میں سمجھا کوئی بڑی اہم بات ہونے والی ہے۔ وہ مجھے شہر کے باہر کے میدان میں لے گیا۔ اور راستے بھر تاکید کرتا رہا کہ یہ ملاقات ہمیشہ صیغۂ راز میں رہنی چاہیے۔ پھر اس نے دور سے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرکے کہا: "اس کے پاس جاؤ اور جب وہ چلتے چلتے ٹھہر جائے تو اس سے کہو کہ میں ایک نووارد ہوں۔"

ہر اسرار میں لطف کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات مجھے سراسر مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ کیوں کہ دن دہاڑے چڑھی ہوئی دھوپ میں ایک آدمی کھلے میدان میں ڈگ بھرتا چلا جارہا تھا۔ اس میں بھید کی بھلا کیا بات ہوسکتی تھی۔

جب قبرستان کے پھاٹک پر اس سے میری مڈبھیڑ ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لڑکا ہی جس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر شعلہ بار گول گول آنکھیں ٹکی ہوئی ہیں۔ وہ اسکول کی وردی پہنے ہوئے تھا جو جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔فی الجملہ اس پر کسی ایسے پرندے کا گمان ہوتا تھا جس کے بال و پر قبل از وقت جھڑ گئے ہوں اور جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ بھرپور جوان ہی۔

ہم قبروں کے درمیان جھاڑی کے پاس بیٹھ گئے اور وہ ایسے پھیکے انداز میں وعظ کہنے لگا گویا کوئی اہم معاملہ طے ہو رہا ہی—— اس پوچھ پاچھ کے بعد کہ میں کیا پڑھتا ہوں، اس نے رائے دی کہ تم فلاں حلقۂ مطالعہ میں شریک ہو جاؤ۔ وہ خود اس کا ناظم تھا۔جب میں نے ہامی بھر دی تو وہ دائیں بائیں دیکھتا پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا چل دیا۔

یہ حلقہ جن تین چار نوجوانوں پر مشتمل تھا ان میں میں سب سے کم عمر تھا۔ہم میں سے کوئی ایڈم اسمتھ کی کتاب " قوموں کی دھن دولت" کے سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا۔ہم لوگ 'ملوسکی' نامی معلم کے کمرے میں ملا کرتے تھے۔ ملوسکی نے بعد میں ایک فرضی نام سے بہت سے مختصر افسانے بھی لکھے۔ ان کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی تھیں کہ وہ خودکشی کرکے مرگیا۔ ایسے کتنے ہی لوگوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا جنھوں نے بعد میں اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی ختم کر دی۔

ملوسکی ایک گندے مکان کے تہ خانے میں رہتا تھا اور روح و جسم میں توازن قائم رکھنے کے لیے شوقیہ بڑھئی کا کام کیا کرتا تھا۔وہ کم سخن تھا اور بہت سوچ سوچ کر باتیں کرتا تھا۔مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہوئی،

اور نہ ایڈم اسمتھ کی بھاری بھرکم کتاب میں میرا دِل لگا۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں جو اصول بیان کیے گئے تھے مَیں ان سے بہ خوبی آشنا تھا۔ میری پوری عمر ان کی جیتی جاگتی تفسیر تھی۔ اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ جو حقیقت ہر اس آدمی کے لیے بیّن ہی جو روٹیوں کے لیے دوسروں کی غلامی پر مجبور ہی اس کے اظہار کے لیے پیچیدہ عبارت میں موٹی موٹی کتابیں لکھنے کی کیا ضرورت ہی۔ چناں چہ اس تاریک تہ خانے میں دو تین گھنٹے بیٹھ کر یہ توتا کہانی سُننا میرے لیے بڑی پتّاماری کا کام تھا۔

ایک بار ہمارے اُستاد کو آنے میں دیر ہوئی تو ہم کچھ کھانے پینے کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ابھی بوتل کا کاگ کُھلا بھی نہ تھا کہ اس چوبِ خشک کے پانو کی آہٹ سُنائی دی۔ جلدی سے ہم نے بوتل میز کے نیچے چُھپادی اور جب اس نے معاشیات کے گُر سمجھانے شروع کیے تو ہم دم بہ خود بیٹھے رہے۔ ہر لمحہ یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ دیکھیے کس کی ٹھوکر سے بوتل اُلٹتی ہی۔ وہ تو کہیے کہ خود واعظ نے جوش میں وہ دولتّی جھاڑی کہ بوتل گر پڑی۔ اس نے میز کے نیچے جھانک کر دیکھا لیکن زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ تاہم اس کے ماتھے پر شکن پڑ گئی تھی اور آنکھوں سے غصّہ جھلک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مَیں دِل میں سخت نادم ہوُا اور میرے ساتھیوں کے چہرے بھی شرم سے تمتما گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ ہم نے شراب لاکر اُستاد کی توہین کی ہی۔

ان تقریروں سے اُکتاکر میرا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ تاتاریوں کی بستی کی سیر کروں جہاں صاف سُتھرے اور نیک دِل انسان رہتے اور عجیب قسم کی ٹوٹی پھوٹی روسی بولا کرتے تھے۔ شام کو مسجد کے مینار پر کھڑا ہو کر موذن انھیں نماز کی دعوت دیتا۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ تاتاریوں کی زندگی ہم سے بالکل مختلف

ہی۔ میں جس ماحول سے واقف تھا اس سے مجھے نفرت تھی لیکن تاتاری میرے لیے بالکل انوکھے تھے اور ان کی ہر بات مجھے نرالی معلوم ہوتی تھی۔

محنت کی موسیقی مجھے دریائے وولگا کی طرف کھینچ کر لے جاتی تھی آج بھی جب یہ موسیقی کانوں تک پہنچتی ہی تو میرا دل باغ باغ ہوجاتا ہی اور مجھے وہ دن یاد آتا ہی جب اوّل اوّل میں نے محنت میں مضمر شاعری کو سمجھا تھا۔

ایک بجرا ایران سے مال لیے آرہا تھا کہ قازان کے قریب اس کے بادبان خراب ہوگئے۔ اوروں کے ساتھ میں بھی یہ مال اُتارنے میں لگ گیا۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ پورب کی طرف سے زور کی ہوا چل رہی تھی۔ اور کف آلود موجیں دریا کے سینے پر دیوانہ وار مچل رہی تھیں۔ ہم سب کوئی پچاس آدمی ہوں گے موم جامہ سر سے لپیٹے ہم عرشے پر کھڑے تھے اور بجرے کو ایک چھوٹا سا اگن بوٹ آہستہ آہستہ کھینچے لیے جارہا تھا۔ چنگاریاں مینھ کی بوندوں سے مل کر عجب گُل کِھلا رہی تھیں۔

شام ہوچلی تھی اور بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان اپنا سیاہ لبادہ دریا کی طرف بڑھا رہا تھا۔ جہازی بادوباراں کے ساتھ زندگی کو کوس رہے تھے اور سردی و بارش سے بچنے کے لیے عرشے میں یہاں وہاں پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ان کی کاہلی اور بے رُخی کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ ڈوبتے ہوئے مال کو بھلا یہ کیا بچائیں گے۔

خُدا خُدا کرکے آدھی رات کو بجرہ کنارے لگا۔ ہمارے سردار نے جو ایک زبان دراز اور چیچک رو بوڑھا تھا، گنجی کھوپڑی سے گیلی ٹوپی اُتار کر زنانہ آواز میں نعرہ لگایا: "لڑکو، دعائے خیر کرو!"

جہازی قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے اور ریچھوں کی طرح بڑبڑانے لگے۔

جلدی سے سلام پھیر کر سردار نے کہا: "قندیلیں روشن کرو! لڑکو، اب کمال دکھلانے کا وقت آ گیا۔ کام میں بھڑ جاؤ بھائیو۔"

یہ کہنا تھا کہ یہ کاہل جہازی کمال کے ہاتھ دکھلانے لگے۔ بجرے کے گوداموں میں وہ اس جوش و خروش سے گھس پڑے گویا یہ دشمن کی کمین گاہ تھی اور ہر طرف سے قہقہہ، کل کاری اور تکبیر کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ قالین چاول کے بورے، کشمش کے تھیلے اور پوستین کے پلندے میرے ارد گرد اس طرح اُڑنے لگے گویا نرم و گداز تکیے ہیں اور گرانڈیل جوان سیٹی بجاتے، گالی دیتے یا بے سُرے راگ الاپتے ہوئے اِدھر سے اُدھر دوڑنے لگے۔ ان کے دلولے اور مسرت کو دیکھ کر یقین نہ آتا تھا کہ وہی لوگ ہیں جو ابھی دُنیا اور زندگی کو کوستے بیٹھے تھے۔ ہوا یخ بستہ تھی اور دھنواں دھار بارش ہونے لگی تھی۔ لیکن قندیلوں کی دھیمی روشنی میں سب اَن تھک کام کیے جاتے تھے۔ کئی کئی من وزنی گٹھر پیٹھوں پر لادے یہ لوگ خوشی خوشی اس طرح آ جا رہے تھے گویا مدت سے مشقت کے پیاسے ہوں۔

ایک ڈیل ڈول آدمی نے جو چمڑے کے لمبے کوٹ میں ملبوس تھا اور بجرے کا مالک یا مختار معلوم ہوتا تھا، آواز لگائی:

"جوانو، میں تمھیں انعام میں تین ——— بلکہ پانچ گیلن شراب دوں گا زور لگاؤ بھیا!"

ہر طرف سے آواز آنے لگی: "آٹھ گیلن"

"چلو یہی سہی۔ آٹھ گیلن۔ لیکن کام میں سُستی نہ ہو۔"

اب تو کام کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ میں بھی بوریوں اور تھیلیوں کو لیے چرخی کی طرح دوڑ بھاگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب قدم بلائے

ناچ رہے ہیں۔ اور اسی جوش اور اسی رفتار سے مہینوں بلکہ برسوں متواتر کام کیے جائیں گے۔ گمان ہوتا تھا کہ ہم شہر کے میناروں اور گنبدوں کو ہتیلی پر گیند کی طرح اُچھال کر یہاں سے وہاں رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اب تک مَیں نے ایسی خوشی کی رات بسر نہ کی تھی۔ اس خیال سے کہ اسی طرح دیوانہ وار محنت کرتے زندگی گزر جائے گی۔ میری روح۔ مست ہوگئی۔ ہَوا کے تھپیڑے بجرے کو جھولا جُھلا رہے تھے، موجیں عرشے پر چڑھی آتی تھیں اور صبح کا ستارہ ماند پڑ رہا تھا۔ تاہم یہ ننگے بھوکے انسان اپنی محنت کے غرّے میں تکان سے بے خبر کام میں جٹے ہوئے تھے۔

اب ہَوا نے بادل کی چادر کو ایک طرف سے چیر دیا تھا اور اس شگاف سے سورج کی ایک کرن مُسکرا رہی تھی۔ اپنے گیلے بالوں کو نچوڑ کر سادہ لوح مزدوروں نے ایک نعرۂ مسرّت سے اس کا استقبال کیا۔ وہ سب اپنے بے لوث طریقے سے محنت کے نشے میں متوالے ہوگئے تھے کہ جی چاہا انھیں چوم لوں۔

بے کراں قوّت و محنت کے اس سیلاب کے آگے بھلا دُنیا کی کون سی شے ٹھیر سکتی تھی۔ یہ قوّت دُنیا میں کایا پلٹ کر سکتی تھی اور حکم ملتے ہی راتوں رات شہر کے شہر بسا سکتی تھی۔ انسانوں کی اس کار گزاری کو دم بھر دیکھ کر سورج کی اس کرن نے بادلوں میں مُنھ چھپا لیا اور دوبارہ دھنواں دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس کے باوجود سہ پہر تک لگاتار کام کا سلسلہ جاری رہا اور ہم نے دم اس وقت لیا جب شکستہ کشتی کا کُل مال دُوسرے بجرے پر اُٹھ گیا۔ اس طرح زندگی میں پہلی مرتبہ مَیں نے محسوس کیا کہ انسان میں کتنی طاقت پوشیدہ ہے اور منظّم ہوکر وہ کیا کر سکتی ہے۔

اس کے بعد سب جہازی اگن بوٹ پر بے جان لاشوں کی طرح پڑ گئے اور قازان تک بے خبر سوتے رہے۔ وہاں اُتر کر ہم نے ایک شراب خانے کی

راہ لی جہاں شراب کے آٹھ گیلن ہمارے منتظر تھے۔

آوارہ گرد بشکن مجھ سے ملنے آیا اور سر سے پیر تک میرا جائزہ لے کر پوچھا: "ان کم بختوں نے تو تمھارا کچومر نکال دیا۔"

مَیں نے بڑی اُمنگ سے اُسے اپنا کارنامہ سُنایا۔ لیکن اس بندۂ خدا نے حقارت سے منھ بنا کر کہا: "میاں، مَیں تو تمھیں فقط بھولا بھالا سمجھتا تھا۔ لیکن تُم نِرے کاٹھ کے اُلّو نکلے۔"

یہ کہہ کر وہ سیٹی بجاتا ہوا جہازیوں کی میز پر جا بیٹھا اور یہ تان چھیڑی ؎

رات اندھیری سجنی اکیلی پیا بِنا گھبرائے
اوڑھ چدریا ہولے ہولے پیا مِلن کو جائے

یہ سُن کر ساری محفل نے بہ یک آواز جوابی بند اوپر اُٹھایا۔ ؎

چوکی دار نے دِیا بار کر بگیا میں جھانکا
پی کی گود میں پیاری سجنی بیٹھی جھونکے کھائے ـــــــ

اور تالیوں و سیٹیوں کے ہنگامے میں یہ گیت دیر تک فضا میں گونجتا رہا۔

کسی نے میرا تعارف دیری نکوف سے کرایا۔ وہ ایک تنگ سی گلی میں پارچوں کی دُکان کرتا تھا اور اس کے عین مقابل ایک خندق تھی جو غلاظت سے بھری رہتی تھی۔ دیری نکوف ایک ہاتھ کا لُولا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے ذہانت اور چہرے سے شرافت عیاں تھی۔ شہر میں کسی کے پاس ضبط شدہ کتابوں کا اتنا اچھا مجموعہ نہ تھا اور قازان بھر کے طلبا اور انقلاب پسند انھیں پڑھنے کے لیئے جمع ہوا کرتے تھے۔

اس کی دُکان ایک چھوٹے سے مکان میں تھی جس کے پڑوس میں ایک خُردہ فروش ہیجڑا رہتا تھا۔ دُکان کے پیچھے ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں آنگن

کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے ہلکا ہلکا سا اُجالا آتا تھا۔ اس سے لگ کر باورچی خانہ تھا اور اسی کے ساتھ ایک اندھیری کوٹھری جس میں یہ ممنوعہ کتب خانہ تھا۔ کئی انقلابی تحریروں کو ہاتھ سے نقل کیا گیا تھا اور متواتر مطالعے کی وجہ ان مسودوں کی حالت بہت ابتر ہوگئی تھی۔

جب مَیں پہلی بار دُکان میں گیا تو ویری نکوف سودا سلف میں مصرُوف تھا۔ اس نے سر کی جنبش سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ اندر کے کمرے میں داخل ہوکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں نہایت انہماک سے عبادت کررہے ہیں۔ ان کی موجودگی پر مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ ویری نکوف جیسے انقلاب پرور کے گھر میں خداپرستی کا کیا موقع تھا۔

دعا ختم کرکے بڑے میاں نے سر اور ڈاڑھی کے بال سلجھائے اور مجھے غور سے دیکھ کر کہا:

"مَیں ویری نکوف کا باپ ہوں اور تم کون ہو؟ ...... خوب، خوب، مَیں تو سمجھا کہ کوئی اور طالب علم کے بہروپ میں نمودار ہوا ہے۔"

مَیں نے پوچھا: "طالب علم کو بہروپ کی کیا ضرورت؟"

"مَیں بھی تو یہی کہتا ہوں! اور میاں، تُم لاکھ بھیس بدلو لیکن خُدا تمھیں ہر حال میں پہچان لے گا۔"

وہ باورچی خانے کی طرف چلا گیا اور مَیں کھڑکی کے پاس کھڑا کچھ سوچنے لگا۔ اتنے میں یہ آواز کان پڑی:

"یہ ہیں اُن حضرت کا حُلیہ شریف۔"

ایک سفید پوش لڑکی باورچی خانے کی چوکھٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے حسین بال کٹے ہوئے تھے اور سہانے چہرے پر نیلی آنکھیں روشن تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی سستے چوکھٹے پر ایک حور کی تصویر جڑ دی گئی ہو۔

"آپ ڈر کیوں گئے؟ کیا مَیں اتنی ڈراؤنی ہوں؟" اس نے اونچی آواز میں کہا۔ اور دیوار تھام کر اس احتیاط سے میری طرف بڑھنے لگی گویا زمین پر نہیں رسّی پر چل رہی ہو۔ اس خرام سے اس پر کوئی غیر مرئی ہستی ہونے کا گمان دوچند ہوگیا۔ وہ ایڑی سے چوٹی تک اس طرح کانپ رہی تھی گویا اس کے تلووں میں کانٹے چبھ رہے ہوں۔

میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور اس پر مجھے ایسا ترس آیا کہ گلا رُندھ گیا۔ یہاں کی ہر شے پُراسرار تھی۔

وہ احتیاط سے کُرسی پر بیٹھی گویا اس کے اُڑ جانے کا ڈر ہو۔ اس کے کہنے سے معلوم ہوا کہ بیماری کی وجہ سے وہ تین مہینے چل پھر نہ سکی اور صرف پانچ روز سے ہاتھ پانو ہلا رہی ہے۔

"اعصابی کمزوری کی شکایت تھی۔" اس نے مسکرا کر کہا

اس کی یہ بات مجھے پسند نہ آئی۔ اعصاب کی کمزوری کیا اتنا طُول کھینچ سکتی ہے کہ ایک نوجوان مہینوں پلنگ توڑتا رہے۔

اپنی معصوم آواز میں وہ پھر بولی: "مَیں نے آپ کا نام سُنا تھا، اسی لیے ملنے کو جی چاہا۔"

اس کی نگاہ اتنی تیز تھی کہ مَیں بغلیں جھانکنے لگا۔ ایسی لڑکی سے دُوبدُو گفتگو میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے مَیں چُپ چاپ دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔

ایک لڑکا جو میرا ہم عمر ہوگا دُکان سے لپک کر باورچی خانے میں غائب ہوگیا اور جاتے جاتے پُکار کر کہا: "ماریا، تُم وہاں کیا کر رہی ہو؟"

لڑکی مجھ سے مخاطب ہوکر بولی: "یہ میرا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ مَیں نے نرس کا کام سیکھنا شروع ہی کیا تھا کہ بیمار پڑگئی ـــــــــــ آخر آپ چُپ چپ کیوں ہیں؟ بہت شرمیلے معلوم ہوتے ہیں۔"

اسی وقت دیری نکوف اندر آیا۔ اپنی بہن کے نرم بالوں کو سلجھاتے اور اُلجھاتے ہوئے اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور پھر لڑکی کو یہ کہتے ہوئے لے گیا:

"ماریا، تمھیں آرام کرنا چاہیے۔"

لڑکی کے نام میں کچھ مٹھاس نہ تھا۔

مَیں بھی سخت اضطراب کے عالم میں چلتا بنا۔ لیکن دوسرے روز شام کو دوبارہ وہاں آنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ ان سب کی زندگی ایسی عجیب وغریب تھی کہ مجھے خواہ مخواہ تجسس ہونے لگا۔

بڑے میاں کونے میں بیٹھے کمرے کی ہر چیز پر نظر دوڑا رہے تھے۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اور دبوپن کے علاوہ کسی نامعلوم مصیبت کا احساس ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا۔

دیری نکوف کے کوٹ پر گھی اور آٹے کی ہوتی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ اور وہ کمرے میں اس طرح چہل قدمی کیا کرتا تھا گویا کسی بچّے نے ابھی اپنی شرارت کی معافی مانگی ہو۔

چھوٹا بھائی الکسی جو سخت مزاج ہونے کے علاوہ کاہل بھی تھا، دکان میں کام کرتا تھا۔ اس سے بڑا کالج کے بورڈنگ میں رہتا اور صرف چھٹیوں میں گھر آتا تھا۔ بیمار ماریا کہیں اوپر رہتی تھی اور بہت کم نیچے آتی تھی۔ اس کا سامنا ہوتے ہی نہ جانے کیوں میری گھگھی بندھ جاتی تھی۔

گھر کی دیکھ دیکھ مالکِ مکان ہیجڑے کی رکھیلی کے سپرد تھی۔ یہ ایک

سوکھی ساکھی عورت تھی جس کا چہرہ گڑیوں کا سا سپاٹ اور چتون کسی بگڑے دل راہبہ کی سی تیکھی تھی۔ اس کی بیٹی 'نستیا' کی ناک مردوں کی قربت میں آپ ہی آپ تھرکنے لگتی تھی۔

سچ پوچھا جائے تو دیری نکوف کے گھر کے مالک شہر کے طالب علم تھے۔ انھیں روس اور اس کے عوام کے مستقبل کی طرف سے ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا تھا اخبار کے واقعات اور شہر کے حالات انھیں ہمیشہ پریشان رکھتے تھے۔ شام کے وقت طالب علموں کے جھنڈ کے جھنڈ شہر کے ہر گوشے سے آکر دیری نکوف کی دُکان میں جمع ہوتے اور بحث مباحثہ و سرگوشیوں کا لامتناہی سلسلہ چھڑ جاتا۔ وہ اپنے ساتھ موٹی موٹی جلدیں لاتے اور اپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں ان کی سند پیش کرتے تھے یہ سوچ کر کہ ان کی حیثیت ناقابلِ تردید ہو۔

مَیں اس قسم کی بحث کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ الفاظ کے گورکھ دھندے میں اصل موضوع غائب ہوجاتا تھا۔ طلبہ اور پرانی قسم کے پادریوں میں کسی قسم کا فرق نہ تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہو کہ نظامِ زندگی میں اصلاح کرنے کے لیے بے چین تھے اور ان کا خلوص الفاظ کے سیلاب میں نہ بہہ سکتا تھا۔ وہ جن مسائل کا حل تلاش کر رہے تھے مَیں ان سے بہ خوبی آشنا تھا اور دِل و جان سے چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے حل ہوجائیں۔ میرے دِل میں جو خیالات چھپے ہوئے تھے یہ لوگ انھی کا اظہار کرتے تھے اور ان کی گفتگو سُن کر مجھے ایسی خوشی ہوتی جیسے کسی قیدی کو آزادی مل گئی ہو۔

لوگ مجھے اسی نظر سے دیکھتے تھے جیسے کوئی بڑھئی ایک کندۂ ناتراش کو دیکھے اس امید کے ساتھ کہ کٹ چھنٹ کر اس سے کوئی کام نکل آئے گا۔ ایک دوسرے سے وہ میرا ذِکر اس طرح کرتے جیسے بچّوں کو کھیلتے کھیلتے سڑک پر بہیہ

پڑا ہل گیا ہو۔ وہ جیسے ”ابن الوقت“ ...

زرا بھی پسند نہ تھا کیوں کہ زندگی نے مجھ سے سوتیلی ماں کا سا برتاؤ کیا تھا۔ اور پھر مجھے اس قوت کا بھی احساس تھا جس کے اثر سے میرے ذہن کا سانچہ بن رہا تھا۔ کسی کتب خانے میں میں نے ”حکایات و روایات“ نامی کتاب کا سرِورق دیکھا اور دینیات کے ایک طالب علم سے درخواست کی مجھے اسے پڑھنے کا موقع دے۔

اس ہونہار پادری کے دانت بڑے، ہونٹ موٹے اور بال گھنگھرالے تھے۔ بس حبشی لگتا تھا۔ اس نے حقارت سے کہا: ”یہ منھ اور مسور کی دال۔ میاں، اِدھر اُدھر نہ بھٹکو۔ تم سے جو کہا جائے وہی پڑھو اور بے تعلق چیزوں کی طرف نہ جاؤ۔“

اس کی اس درشتی پر میں سخت برہم ہوا۔ اور کچھ کما کر کچھ قرض لے کر یہ کتاب خرید لایا۔ یہ پہلی سنجیدہ کتاب تھی جو میں نے خریدی اور وہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔

بہرحال عالموں نے مجھ سے ہمدردی کا سلوک نہ کیا۔ مثلاً عمرانیات کی ایک کتاب کی چند باتوں پر مجھے اعتراض ہوا۔ جب میں نے اپنے شبہات کا اظہار ایک طالب علم سے کیا تو وہ ایک گھنٹے تک مجھے سمجھاتا رہا کہ تنقید کا حق کن لوگوں کو ہے۔

اس نے پوچھا: ”تنقید کے لیے ضروری ہے کہ نقاد کسی نہ کسی اُصول کو مانتا ہو۔ کہو تو سہی کہ تم کس اصول کو مانتے ہو؟“

راہ چلتے وہ کتاب پڑھا کرتا اور راہ گیروں سے بارہا ٹکرایا کرتا تھا۔ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو کر وہ چلانے لگا:

"آزادی اور ضبط کے امتزاج سے ہی اخلاق بن سکتا ہے۔"

وہ سدا روگی تھا اور وجہ یہ تھی کہ دن رات حقیقت کی جستجو کے بعد بھی اسے پیٹ بھر کھانا میسر نہ ہوتا تھا۔ مطالعے کے سوا اس کا اور کوئی مشغلہ نہ تھا اور جب وہ یہ محسوس کرتا کہ دو عالموں کے ظاہری اختلاف کو اس نے اتحاد کی شکل میں بدل دیا ہے، تو خوشی کے مارے اس کا پیلا چہرا دمک اٹھتا۔ دس سال بعد جب میں اس سے خارکوف میں ملا تو وہ از سر نو یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اس اثنا میں پانچ برس دیس نکالے کی سزا بھگت چکا تھا۔ وہ متضاد اور مختلف خیالات کے ہیولا میں دبا ہوا تھا اور اب نطشے اور کارل مارکس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی فکر میں تھا۔

"امتزاج کے بغیر زندگی ناممکن ہے" یہ فتوا دیتے ہوئے وہ خون تھوکنے لگا اور اپنی سرد انگلیوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

ایک دن یونی ورسٹی جاتے ہوئے ٹرام کار میں اس کی جان نکل گئی۔ علم اور حقیقت کی راہ میں میں نے ایسے کتنے ہی لوگوں کو شہید ہوتے دیکھا اور ان کی یاد میرے لیے متبرک ہے۔

دیری نکوف کے گھر میں کوئی دو درجن گرم دل جوانوں کا مجمع رہتا تھا۔ ان میں سے ایک تو جاپانی تھا۔ اس کا نام "سیٹو" تھا اور وہ دینیات کے مدرسے میں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی ایک اونچا پورا ڈڈھیل آدمی جس کا سر تاتاریوں کی طرح گھٹا ہوا تھا، شریکِ محفل ہوتا۔ وہ قزاق فیشن کے کوٹ میں ملبوس ہوتا۔ جس میں ٹھوڑی تک بٹن ٹنکے ہوتے تھے۔ وہ کونے میں بیٹھ کر چپ چاپ پائپ پیا کرتا۔ اور اپنی تیز آنکھوں سے ہر چیز کا جائزہ لیا کرتا۔ اکثر اس کی نگاہ مجھ پر گڑ جاتی اور یہ سوچ کر کہ وہ میرے دل میں چھپے ہوئے وسوسوں کا

مطالعہ کر رہا ہے، میں گھبرا جاتا۔ اس کی خاموشی سے مجھے سخت حیرت ہوتی کیونکہ اور سب لوگ لن ترانی ہانکنے میں محو ہوتے تھے اور ہر شخص کی کوشش ہوتی کہ کسی نئے فرقے کی داغ بیل ڈالے۔ بحث میں جتنی گرمی پیدا ہوتی میری دل چسپی اتنی ہی بڑھ جاتی تھی۔ بہت دنوں بعد مجھ میں یہ سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ یہ ساری چرب زبانی کتنی بے کار اور پادر ہوا تھی۔

یہ خاموش اور سنجیدہ آدمی نوکول نام سے موسوم تھا۔ اور دیری نکوف کے علاوہ کسی کو اس کے اصلی نام کا پتا نہ تھا۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ سائبیریا میں دس سال کی سزا کاٹ کر وہ ابھی ابھی لوٹا تھا۔ یہ سن کر اس سے میری دل چسپی اور بھی بڑھ گئی، لیکن اس سے ملنے کی جرات نہ ہوئی۔ یہ نہیں کہ میں کم آمیز یا دامن کش تھا۔ اس کے برعکس مجھ میں ضرورت سے زیادہ تجسس تھا اور میں جلد از جلد ہر شے کو جاننے کی کوشش میں سرگرداں رہتا تھا۔ یہ میرے مزاج کا ایسا نقص ہے جس کے سبب سے میں کبھی کسی ایک مضمون پر جم کر کام نہ کر سکا۔

یہ علما جب عوام کا ذکر کرتے تو میں کسی طرح ان کی رائے سے اتفاق نہ کر سکتا تھا۔ ان کے نزدیک عام انسان عقل اور انصاف کا پتلا تھا جس میں خدا تعالیٰ کی جملہ روحانی صفات سمٹ آئی تھیں۔ افسوس کہ یہ خوبیاں میرے مشاہدے میں نہ آئیں گو کہ میں ان کی بہ نسبت عوام سے زیادہ واقف تھا۔ میری رائے ناقص میں تو یہ لوگ جو عوام کو روحانیت کے دیوتا سمجھتے تھے، اور جان بوجھ کر انھیں اپنے سے بلند مرتبہ دیتے تھے، خود ان سب خوبیوں کے حامل تھے۔ دوسروں کی خاطر یہ ہر طرح کے دکھ جھیلتے تھے اور اپنی برتری کو مٹا کر سماج میں ایسی اصلاح کرنا چاہتے تھے کہ عوام کی زندگی سدھر جائے۔

اب تک جن عامیوں میں میری عمر گزری تھی، ان میں مجھے کردار یا اخلاق

"آزادی اور ضبط کے امتزاج سے ہی اخلاق بن سکتا ہے ۔"

وہ سدا روگی تھا اور وجہ یہ تھی کہ دِن رات حقیقت کی جستجو کے بعد بھی اسے پیٹ بھر کھانا میسر نہ ہوتا تھا ۔ مطالعے کے سوا اس کا اور کوئی مشغلہ نہ تھا اور جب وہ یہ محسوس کرتا کہ دو عالموں کے ظاہری اختلاف کو اس نے اتحاد کی شکل میں بدل دیا ہے، تو خوشی کے مارے اس کا پیلا چہرا دمک اُٹھتا ۔ دس سال بعد جب میں اس سے خارکوف میں ملا تو وہ ازسرِ نو یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اس اثنا میں پانچ برس دیس نکالے کی سزا بھگت چکا تھا ۔ وہ متضاد اور مختلف خیالات کے ہیولا میں دبا ہوا تھا اور اب نیتشے اور کارل مارکس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی فکر میں تھا ۔

"امتزاج کے بغیر زندگی ناممکن ہے" یہ فتوا دیتے ہوئے وہ خون تھوکنے لگا اور اپنی سرد اُنگلیوں سے میرا ہاتھ تھام لیا ۔

ایک دن یونی ورسٹی جاتے ہوئے ٹرام کار میں اس کی جان نکل گئی ۔ علم اور حقیقت کی راہ میں میں نے ایسے کتنے ہی لوگوں کو شہید ہوتے دیکھا اور ان کی یاد میرے لیے متبرک ہے ۔

دیری نکوف کے گھر میں کوئی دو درجن گرم دل جوانوں کا مجمع رہتا تھا ۔ ان میں سے ایک تو جاپانی تھا ۔ اس کا نام "سیبو" تھا اور وہ دینیات کے مدرسے میں پڑھتا تھا ۔ کبھی کبھی ایک اونچا پورا ڈڈھیل آدمی جس کا سر تاتاریوں کی طرح گھٹا ہوا تھا، شریکِ محفل ہوتا ۔ وہ قزاق فیشن کے کوٹ میں ملبوس ہوتا ۔ جس میں ٹھوڑی تک بٹن ٹنکے ہوئے تھے ۔ وہ کونے میں بیٹھ کر چپ چاپ پائپ پیا کرتا ۔ اور اپنی تیز آنکھوں سے ہر چیز کا جائزہ لیا کرتا ۔ اکثر اس کی نگاہ مجھ پر گڑ جاتی اور یہ سوچ کر کہ وہ میرے دِل میں چھپے ہوئے وسوسوں کا

مطالعہ کر رہا ہے، میں گھبرا جاتا۔ اس کی خاموشی سے مجھے سخت حیرت ہوتی کیونکہ اور سب لوگ لن ترانی ہانکنے میں محو ہوتے تھے اور ہر شخص کی کوشش ہوتی کہ کسی نئے نظریے کی داغ بیل ڈالے۔ بحث میں جتنی گرمی پیدا ہوتی میری دل چسپی اتنی ہی بڑھ جاتی تھی۔ بہت دنوں بعد مجھ میں یہ سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ یہ ساری چرب زبانی کتنی بے کار اور پادر ہوا تھی۔

یہ خاموش اور سنجیدہ آدمی خوکول نام سے موسوم تھا۔ اور دیری نکوف کے علاوہ کسی کو اس کے اصلی نام کا پتا نہ تھا۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ سائبیریا میں دس سال کی سزا کاٹ کر وہ ابھی ابھی لوٹا تھا۔ یہ سن کر اس سے میری دل چسپی اور بھی بڑھ گئی، لیکن اس سے ملنے کی جرات نہ ہوئی۔ یہ نہیں کہ میں کم آمیز یا دامن کش تھا۔ اس کے برعکس مجھ میں ضرورت سے زیادہ تجسس تھا اور میں جلد از جلد ہر شے کو جاننے کی کوشش میں سرگرداں رہتا تھا۔ یہ میرے مزاج کا ایسا نقص ہے جس کے سبب سے میں کبھی کسی ایک مضمون پر جم کر کام نہ کر سکا۔

یہ علم جب عوام کا ذکر کرتے تو میں کسی طرح ان کی رائے سے اتفاق نہ کر سکتا تھا۔ ان کے نزدیک عام انسان عقل اور انصاف کا پتلا تھا جس میں خدا تعالیٰ کی جملہ روحانی صفات سمٹ آئی تھیں۔ افسوس کہ یہ خوبیاں میرے مشاہدے میں نہ آئیں گو کہ میں ان کی بہ نسبت عوام سے زیادہ واقف تھا۔ میری رائے ناقص میں تو یہ لوگ جو عوام کو روحانیت کے دیوتا سمجھتے تھے، اور جان بوجھ کر انھیں اپنے سے بلند مرتبہ دیتے تھے، خود ان سب خوبیوں کے حامل تھے۔ دوسروں کی خاطر یہ ہر طرح کے دکھ جھیلتے تھے اور اپنی برتری کو مٹا کر سماج میں ایسی اصلاح کرنا چاہتے تھے کہ عوام کی زندگی سدھر جائے۔

اب تک جن عامیوں میں میری عمر گزری تھی، ان میں مجھے کردار یا اخلاق

کی کوئی بلندی نظر نہ آئی۔ یہ عالموں کے تصوّر کی اُپج تھی اور بس۔ تاہم عوام کے ان عاشقوں کی گفتگو میرے لیے باعثِ تسکین تھی۔ اسی طرح وہ ادب جو کسانوں کی خستہ حالی کی دُکھ بیتی سُناتا تھا، میرے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آیا کہ انسانیت سے محبت کر کے ہی فرد زندگی کی اصل حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد میں نے نجی مسائل پر وقت ضائع کرنا چھوڑ دیا اور دوسروں کے دُکھ سُکھ پر سوچ بچار کرنے لگا۔

دیری نکوف نے مجھے یہ راز بتایا کہ اس کی دُکان کا سارا نفع ان لوگوں کی مدد کے لیے وقف ہے جو عوام کی خاطر سب کچھ قربان کر چکے ہیں۔ ان کتابی اصلاح پسندوں کی گرم جوشی سے اسے انتہائی مسرّت ہوتی تھی۔ اپنے مفلوج ہاتھ کو سینے میں چھپائے اور سادگی سے مُسکراتے ہوئے وہ مجھ سے برابر خیر و عافیت پوچھا کرتا اور اس کا دوسرا ہاتھ ڈاڑھی کی خبر لاتا تھا۔

مویشیوں کا ڈاکٹر لیف روف بطخ کی طرح چیخ کر اصلاح پسندوں کو بے نقط صلواتیں سُنایا کرتا تھا اور بے چارا دیری نکوف کانوں میں انگلی رکھ کر زیرِ لب کہتا: ”کیسا خبیث ہے یہ جانور!“

گو دیری نکوف ہمارا ہم خیال تھا، لیکن طالبِ علم اس سے ایسی درشتی اور لاپروائی سے پیش آتے گویا وہ ان کا نوکر یا قلی ہو۔ وہ غریب اسے محسوس بھی نہ کرتا تھا۔ جب مہمان چلے جاتے تو بسا اوقات وہ مجھے وہیں رات بسر کرنے کی دعوت دیتا۔ کمرہ صاف کر کے ہم فرش پر لیٹ رہتے اور دھیمی آوازوں میں دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ شہ نشین کے چراغ کی ہلکی سی جوت گھٹا ٹوپ اندھیرے کو اُجالنے کی ناکام کوشش کیا کرتی تھی۔

آدمیوں کی تعداد ہزاروں لاکھوں ہے۔ یہ سب ایک دن سارے ملک پر چھا جائیں گے اور دیکھتے دیکھتے سماج میں کایا پلٹ کردیں گے۔"

دیری نکوف عمر میں مجھ سے دس سال بڑا تھا۔ کھلنڈڑی نستیا نے اُسے لُبھالیا تھا۔ لیکن اس کی تیکھی چتون کے مقابلے کی تاب وہ بھی نہ لاسکتا تھا اور دوسروں کے سامنے اس سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوتا تھا۔ بہ ایں ہمہ اُس کے ہر قدم پر اس کا دِل دروُد پڑھتا اور تنہائی میں اس سے ہم کلام ہوتے وقت دیری نکوف شرماکر مسکرا پڑتا تھا۔

اس کی چھوٹی بہن ماریا اگر اتفاق سے کسی مناظرے میں شریک ہوگئی تو لفاظی اور موشگافی سُن سُن کر اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہتی تھی۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پر کبھی ہنسی کے آثار آئے تو کبھی طنز کے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ موضوعِ بحث کو سمجھنے کی کوشش کرتی اور لعنت ملامت کا سلسلہ شروع ہوتے ہی وہ یوں اُچھل پڑتی جیسے کسی نے اس پر برف کا پانی ٹپکادیا ہو۔ پڑوس کا لہار اس کے آگے یوں اکڑ کر چلتا گویا کوئی اصیل مرغ بھی پالا مارکر آیا ہو۔ اور اس سے رازدارانہ سرگوشی بھی کرتا تھا۔ غرض کہ یہ سارا ماحول نہایت دِلچسپ تھا۔

لیکن خزاں کی آمد کے ساتھ میری حالت اتنی ابتر ہوگئی کہ روٹی کمانا ازبس ضروری ہوگیا۔ اس نئی زندگی نے مجھے اتنا موہ لیا تھا کہ میں کام چھوڑکر دوسروں کی روٹی کا محتاج بن گیا۔ اور سب جانتے ہیں کہ دوسروں کی دی ہوئی روٹی زہر سے بھی زیادہ کڑوی ہوتی ہے۔ چناں چہ میں دیمونوف نامی نان بائی کی دُکان میں ملازم ہوگیا۔ زندگی کے اس دَور سے متاثر ہوکر میں نے کئی افسانے لکھے جن میں "چھبّیس مرد اور ایک لڑکی" نامی کہانی بھی شامل ہے۔

جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے یہ کام بڑا سخت تھا۔ لیکن اس سے مَیں نے بہت کچھ سیکھا۔

جب مَیں نان بائی کی دُکان میں داخل ہوتا تو میرے اور ان ساتھیوں کے درمیان ایک سدِ سکندری قائم ہوجاتی جن کی صحبت میری روحانی زندگی کے لیے قطعی ضروری ہوگئی تھی۔ ان میں سے کوئی مجھ سے مِلنے نہ آتا تھا۔ اور چوں کہ مجھے روز مسلسل چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا، اس لیے دیری نکوف کی محفل میں شرکت بالکل ناممکن تھی۔ چھٹی کے دِن مَیں یا تو پڑکر سو رہتا اور یا اسی دھندے میں لگا رہتا تھا۔ ہم کاروں میں سے کئی کی نظر میں مَیں مسخرہ یا بازی گر تھا۔ اور کئی مجھ سے اس طرح پیش آتے جیسے بچّے کسی داستان گو سے مِلتے ہیں۔ واللہ اعلم مَیں ان سے کیا بکواس کرتا تھا۔ لیکن اس کا ماحصل یہ ضرور ہتا کہ وہ کسی بہتر اور برتر زندگی پر ایمان رکھنے لگیں۔ کبھی کبھی مَیں انھیں مشتعل کرنے میں کام یاب ہوجاتا۔ اور جب ظلم و بے انصافی کا کوئی واقعہ سُن کر ان کی آنکھیں غصّے اور نفرت سے چمک اُٹھتیں تو میری خوشی کی حد نہ رہتی۔ مجھے اس خیال سے فخر ہوتا کہ مَیں عوام کو بیدار کررہا ہوں اور ان کی خفتہ رُوح کو جگارہا ہوں۔

لیکن اکثر مجھے اپنی کم علمی اور ناتجربے کاری کا تلخ احساس ہوتا کیوں کہ بہت سی ابتدائی باتوں کے متعلق مَیں ان کے سوالات کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ ایسے موقعوں پر خیال ہوتا کہ مَیں کسی گندی نالی میں گر پڑا ہوں جس میں انسان کیڑوں کی طرح رینگ رہے ہیں۔ ان کی واحد تمنّا یہ ہوتی کہ حقیقت کو بھول جائیں اور خود فراموشی کے یہ لمحات انھیں شراب خانوں اور چکلوں کے سوا کہیں نہ مِل سکتے تھے۔

چکلے کی سیر وہ لوگ مہینے میں صرف ایک دن کر سکتے تھے جب انھیں تنخواہ ملتی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے سے وہ اس عیش کا تصوّر باندھتے اور بعد میں ہفتے بھر اسی یاد میں مگن رہتے تھے۔ اس گفتگو میں ہر شخص اپنی مردانگی کے ذِکر کے ساتھ عورتوں پر لعنت بھیجتا اور ان کا نام آتے ہی حقارت سے تھوکنے لگتا تھا۔

اس کے باوجود مجھے گمان ہوتا کہ اس لاف زنی کی تہ میں شرم اور غم کے تاثرات پوشیدہ تھے۔ چکلے میں جہاں عورت کی ایک رات ایک ٹکے میں خریدی جاسکتی تھی میرے ساتھیوں کا رویّہ شرم ناک ہوتا تھا۔ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی بلکہ ایک فطری امر تھا۔ ان میں سے کئی آزاد منشی کا بہروپ پہنے ہوتے تھے۔ گو اس وقت تک مَیں جنسی تعلق سے ناآشنا تھا لیکن دونوں جنسوں کے باہمی روابط کو سمجھنے کی ادھیڑ بُن میں ہمیشہ رہتا تھا۔ اس وجہ سے میرے دوست اور کہانی طوائفیں دونوں میرا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک میرا رویّہ اس درجہ مضحکہ خیز تھا کہ مجھے 'عیش گاہ' چلنے کی دعوت دینا بھی معیوب سمجھا جانے لگا۔

یارِ غار بے تکلفی سے کہنے لگے۔ "خدا کے لیے تم ہمارے ساتھ نہ چلو۔"

"اس میں کیا ہرج ہے؟"

"بس یہ کہ اس موقع پر تمھاری صحبت ہمیں مرغوب نہیں۔"

مَیں نے اس اعتراض کی وجہ سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ پلے نہ پڑا۔

"بھئی، تم تو جونک کی طرح چمٹ جاتے ہو۔ کہ دیا کہ تمھاری موجودگی

میں ہمیں خاک لطف نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ محلّے کا پادری یا ابّا جان ساتھ لگ گئے ہیں۔"

پہلے تو طوائفیں میرے شرمیلے پن کا مذاق اُڑاتی رہیں۔ لیکن بعد میں انھوں نے تیکھے پن سے پوچھنا شروع کیا:

"ای ہی، کیا ہم اتنی گئی گزری ہیں۔"

ان میں سے چالیس سال کی ایک لمبی تڑنگی حسینہ نے کُتیا کی طرح مجھے سونگھ کر کہا:

"لوگو، ہو نہ ہو یہ کسی لونڈیا پر لٹو ہی۔ ورنہ کیسے ممکن تھا کہ ایسا مسٹنڈا نوجوان عورت بغیر زندہ رہے۔"

یہ (ترزا) ایک ہی پھکڑ تھی اور جشنِ مے نوشی میں ایسی حرکتیں کرتی کہ مجھے اُبکائی آنے لگتی۔ لیکن ہوش کی حالت میں وہ دوسروں کا اتنا خیال رکھتی کہ مجھے حیرت ہوتی۔ خصوصاً دوسروں کے عمل کا تجزیہ وہ ایسی عقل مندی سے کرتی کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔

میرے ساتھیوں سے وہ کہتی: "یہ کالج کے لڑکے بھی چیزے دیگر ہیں۔ فرش کو صابن سے دھوکر وہ لڑکیوں کو ننگی کرتے ہیں۔ پھر انھیں چارو ہاتھ پانو پر چلنے کا حکم دے کر ان کے نیچے برتن رکھ دیتے ہیں۔ وہ اسے دھکیل دیتے ہیں اور دیکھنے لگتے ہیں کہ وہ کس طرح پھسلتی ہی۔ یہ لونڈا بھی حرکت کرتا ہی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہی؟"

"تم جھوٹ بکتی ہو" میں بگڑ کر کہتا۔

"جھوٹ کیوں کہنے لگی۔" اس کی آواز میں اتنی سادگی ہوتی کہ شک

"یہ سب من گھڑت ہے۔"

اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا: "تم مجھے دیوانی سمجھتے ہو، ایں؟ کیا کوئی عورت ایسی باتیں گھڑ سکتی ہے؟"

حاضرین ہمہ تن گوش ہماری بحث کو سنتے تھے۔ لیکن طلبہ کی شرارت کا ذکر ترزا کسی تلخی سے نہ کرتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

سب لوگ طالب علموں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے تھے۔ اور چوں کہ میں اس جماعت کا فدائی تھا، اس لیے اس دلیل کی آڑ پکڑتا کہ وہ لوگ عوام سے محبت کرتے ہیں اور ان کے خیر خواہ ہیں۔

ترزا جواب دیتی: "میں تو صرف دینیات کے طلبہ کی بات کہتی ہوں یہ سب یتیم ہیں اور یتیم بچّہ بڑھ کر یا تو چور ہوگا یا گرہ کٹ۔ اس پر کسی قسم کی ذمّے داری نہیں ہوتی اس لیے اس کا قطعاً غیر ذمّے دار ہونا لازمی ہے۔

جب ترزا کے علاوہ تمام طوائفیں طلبہ کے علاوہ شرفا اور امرا کے متعلق اسی قسم کے قصّے سنانے لگیں تو میرے ساتھیوں کو ان سے نفرت و حقارت کے اظہار کا موقع مل گیا۔ بلکہ انھیں ایک قسم کی خوشی ہوئی جس کا مطلب یہ تھا کہ: "یہ پڑھے لکھے ہم سے بھی گئے گزرے ہیں۔"

شہر کی بدترین آبادی کو گناہ کے تنگ و تاریک گوشوں میں آتے جاتے ہوئے میں دیکھا کرتا تھا۔ جب یہ لوگ اس گناہ آباد سے باہر نکلتے تو ان کے چہرے شہوت میں چھپے ہوئے ہوتے تھے اور ان کے دلوں میں بغض و کمینگی کی آگ بھڑک اُٹھتی تھی۔ بہیمانہ جبلت اور زندگی کی بے رنگی انھیں کھینچ کر جس قعرِ پستی میں لے جاتی تھی وہاں بے معنی الفاظ سے محبت کی

ناکامی کے گیت بنائے جاتے تھے ۔ یہ ماحول انھیں علم اور تہذیب کی تضحیک کا سبق پڑھاتا تھا ۔ اور وہ ایک ایسی برکت کے دشمن بن بیٹھتے تھے جس کے متعلق انھیں کچھ نہ معلوم تھا ۔ ان چکلوں میں جاکر میرے ساتھی جہالت کی پرستش کا سبق سیکھتے تھے ۔

ہارمونکا اور پیانو کی بے سُری تان کے ساتھ ان عورتوں کے بھدے جسم گندے فرش پر مٹکنے لگتے تھے ۔ اور اس نظارے کو دیکھ کر میری طبیعت میں عجیب طرح کا ہیجان پیدا ہوتا تھا ۔ ہر طرف بے قراری پھیل جاتی تھی جس سے متاثر ہوکر روح مچل اٹھتی کہ کہیں دور بھاگ جائیے اور کسی کُنج تنہائی میں پناہ لیجیے ۔

جب تنور خانے میں ان لوگوں کے حالات سناتا جو عوام کی آزادی اور ترقی کے لیے دُکھ جھیل رہے ہیں تو مجھے جواب ملتا : "لیکن طوائفیں ان حضرات کے بارے میں اور ہی کچھ کہتی ہیں ۔"

وہ لوگ بے دردی سے میرا مذاق اڑاتے تھے ۔ اور ان کے لب و لہجے میں ایسی تلخی ہوتی کہ میں بھی انھیں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر مجبور ہوجاتا ۔ اب میں سمجھ چلا تھا کہ زندگی کا مطالعہ زندگی گزارنے سے کم دشوار نہیں ۔ ان لوگوں کی قناعت پر مجھے اکثر غصہ آتا تھا ۔ اور شرابی مالک کے گالی گلوج کو وہ جس طرح چپکے سے برداشت کرلیتے تھے ، اس سے میں جل کر آگ بگولا ہو جاتا تھا ۔

یہ محض اتفاق تھا کہ انھی دنوں میں ایک نئے خیال سے دوچار ہوا اور گو کہ بنیادی طور پر میں اس کا مخالف تھا لیکن اس نے میرے لیے بڑا

رات کا وقت تھا اور برف کے طوفان کا ایسا زور تھا گویا ہوا نے آسمان کے ٹکڑے اُڑا دیے ہوں اور اس کے ذرّے برف بن کر زمین پر ٹپک رہے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی گرمی سرد پڑ گئی اور دُنیا میں زندگی کا کوئی آثار باقی نہیں رہا۔ اس رات کو میں دیری نکوف کے گھر سے تنورخانے لوٹ رہا تھا۔ میں ہوا کے مقابل آنکھ بند کیے چل رہا تھا کہ سڑک پر پڑے ہوئے کسی آدمی سے ٹکرا کر گر پڑا۔ میں نے روسی میں اور اس نے فرانسیسی میں بہ یک وقت ایک دوسرے کو گالی دی۔

اس کی زبان نے مجھے محوِ حیرت کر دیا۔ اور میں نے جُھک کر اس ہلکے پُھلکے آدمی کو پانو کے بل کھڑا کر دیا۔ لیکن مجھے دھکّا دے کر وہ غصّے سے چلّایا: "لعنت ہے! ارے بھلے مانس میری ٹوپی دے ورنہ میں اکڑ کر مر جاؤں گا۔"

میں نے برف سے ٹوپی اُٹھائی اور جھاڑ کر اس کی کھوپڑی پر منڈھ دی۔ لیکن وہ طیش کے عالم میں اسے ہوا میں ہلانے لگا اور دونوں زبانوں میں مجھے کوسنے لگا۔ میری طرف لپک کر وہ چلّایا: "بھاگتا ہے یا نہیں۔"

زرا دیر میں وہ برف کے تودوں میں چھپ گیا۔ میں نے دوبارہ پلٹ کر دیکھا تو وہ روشنی کے کھمبے کو گلے لگا کر کہہ رہا تھا:

"پیاری لینا، میں مر رہا ہوں ——"

میں سمجھ گیا کہ وہ شراب کے نشے میں چور ہے اور اگر میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تو وہ اکڑ کر مر جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ تم کہاں رہتے ہو۔

وہ رواں سا ہو گیا: "یہ کون سی سڑک ہے؟ الٰہی میں کہاں جاؤں؟

اسے سہارا دے کر میں نے آگے بڑھایا اور پوچھتا رہا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ تھر تھر کانپتے ہوئے بالآخر اس نے کہا: "'بلاک' محلہ ——— وہیں کے ایک مکان ———"

وہ قدم قدم پر لڑکھڑا رہا تھا اور ٹھنڈ سے اس کی بتّیسی بج رہی تھی۔ خدا خدا کر کے جب ہم 'بلاک' پہنچے تو اس کا گھر تلاش کرنے میں بڑی دقت ہوئی بڑی مشکلوں سے ایک صدر دالان کے اندر دروازہ نظر آیا۔ اس پر ہلکی سی دستک دے کر اس نے مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ سُرخ لبادے میں ملبوس تھی اور اس کے ہاتھوں میں ایک موم بتّی تھی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو وہ دیر تک مجھے سر سے پانو تک گھورتی رہی اور صرف اس پر اکتفا نہ کر کے وہ کہیں سے چھوٹی سی دُوربین اُٹھا لائی۔

مَیں نے کہا کہ اس آدمی کے ہاتھ سردی سے سُن ہو گئے ہیں اور کپڑے بدل کر اسے لِٹا دینا چاہیے۔

"اوہو، یہ بات ہے؟" اس کی آواز میں اب تک جوانی کا رس تھا۔

"جی ہاں۔ ان کے ہاتھوں کو ٹھنڈے پانی سے دھونا چاہیے۔"

اس نے نہایت اطمینان سے کمرے کے کونے کی طرف اشارہ کیا، جہاں بہتے ہوئے دریا کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ عورت کی بے حسی پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ لیکن وہ اسی انداز سے ایک کرسی پر جا بیٹھی اور تاش کے پتّوں سے پان کا اکّا نکال کر غور سے اسے دیکھنے لگی۔

مَیں نے پوچھا: "گھر میں برانڈی تو ہوگی؟" لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور پتّوں کو میز پر سجانے لگی۔ مرد کُرسی پر پڑا ہوا تھا، اس کا سر جُھک گیا

تھا اور بے جان ہاتھ نیچے لٹک رہے تھے۔ بالکل بے خیالی میں اسے سوفے پر لٹا کر میں نے بے لباس کرنا شروع کیا۔ دیوار کے اس حصّے میں فوٹوگرافوں کی بھرمار تھی اور ایک طرف یہ زرّیں طغرہ لگا ہوا تھا:

"بے ہمتا 'زلدا' کے نام"۔

جب میں نے اس مردِ عجیب کے ہاتھوں کی مالش شروع کی تو وہ غرّا پڑا:

"لعنت ہو! گاؤزوری نہ کر بابا۔"

مگر عورت نے گویا چُپ رہنے کی قسم کھالی تھی۔ وہ بہ دستور تاش کے کھیل میں مُحو رہی۔ اس کا ناک نقشہ چڑیا جیسا نکیلا تھا اور بڑی بڑی روشن آنکھیں کبھی نہ جھپکتی تھیں۔ اس کے گھنیرے بالوں کی شان ہی نرالی تھی اور چڑھتی عمر کے باوجود ہاتھوں میں بلا کی نزاکت تھی۔

دیر کے بعد اس نے آہستہ سے پوُچھا: "جارج، کہیں 'میشا' سے تو ملاقات نہیں ہوئی؟"

جارج مجھے دھکیل کر اُچک کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ جلدی سے بولا:

"نہیں، وہ تو باہر چلا گیا۔"

تاش کے پتّوں پر عورت کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی۔ اور یہ جواب سُن کر اس نے اُداسی سے بس اتنا کہا: "باہر"

جارج نے تسکین دینے کی کوشش کی: "اس کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں۔"

"اچھا؟"

"ہاں، بہت جلدی۔"

عورت نے پھر وہی سوالیہ لفظ دہرایا۔ اب جارج اسی نیم برہنہ حالت میں سوفے سے کود پڑا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر فرانسیسی میں کچھ کہنے لگا۔

عورت نے روسی میں بس اتنا کہا: "مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

"طوفان میں میں راستہ بھول کر کہاں سے کہاں بھٹک گیا! عجب نہیں کہ اکڑ کر مرجاتا۔ سرِراہ ہم نے زراسی شراب بھی پی لی۔" جارج کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اور اس کے چہرے سے فکر و دہشت کے آثار نمایاں تھے۔ اپنے کھردرے بالوں کو وہ زور سے مل رہا تھا اور دھیرے دھیرے اس کا نشہ ہرن ہو رہا تھا۔

عورت نے اسی بے جان آواز میں کہا: "کل ہم میشا سے ملنے کیف چلیں گے۔"

"ضرور، ضرور۔ لیکن اب تمھیں سو جانا چاہیے۔ دیکھو کتنی دیر ہوگئی۔"

"اور اگر میشا آج ہی آگیا تو کیا ہوگا؟"

"اس طوفان میں بھلا وہ کیسے آئے گا۔ آؤ، اب سو رہو۔"

میز سے قندیل اٹھا کر وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور میں اکیلا رہ گیا۔ دیر تک میں سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا دور سے آتی ہوئی عورت کی آواز کو سنتا رہا۔ کھڑکی کے باہر گرتی ہوئی برف میں قندیل کی روشنی ہلکا ہلکا اجالا پھیلا رہی تھی۔ خواب گاہ سامان کی بہتات سے کباڑ خانہ بنا ہوا تھا اور اس میں سے ایسی بوجھل مہک نکل رہی تھی کہ میرا دماغ بالکل معطل ہوگیا۔

جارج نے آکر اطلاع دی: "سوگئی بے چاری۔"

قندیل کو میز پر رکھ کر وہ کسی گہرے سوچ میں پڑ گیا اور کہنے لگا:

"تم نہ ملتے تو غالباً میں مرگیا ہوتا —— میں کس منہ سے تمھارا شکریہ ادا کروں۔ تم کون ہو؟"

خواب گاہ سے آتی ہوئی سرسراہٹ کو سُن کر ایک لمحے کے لیے اس کا جسم لرز اُٹھا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا: "کیا وہ تمھاری بیوی ہیں؟"

"ہاں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ میری زندگی کی واحد امین ہی۔"

اس کے الفاظ اُکھڑے اُکھڑے سے تھے اور آواز بیٹھی ہوئی کھوپڑی کو وہ اب تک ہتھیلی سے سہلا رہا تھا۔

"چائے پینے میں کیا ہرج ہی؟"

باورچی خانے کی طرف جاکر وہ ٹھٹک گیا کیوں کہ نوکر بدہضمی کا علاج کرنے اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ جب میں نے کہا کہ سماوار گرم کرنا کیا مشکل ہی تو وہ بھی رضامند ہوا۔ اسے مطلق یاد نہ تھا کہ اس کا آدھا جسم ننگا ہی اور نہ پاؤں میں جوتی ہی۔

تنور کا سہارا لے کر وہ بولا۔ "تم نہ ہوتے تو میں برف میں دب کر مرجاتا۔ میں اس احسان کو نہ بھولوں گا" اور یک بہ یک اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "میرے بعد اس ڈھیا کی کیا حالت ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ بھائی! اصل قصّہ یہ ہی کہ اس کا بیٹا ماسکو میں گویا تھا۔ اس نے خودکشی کرلی اور یہ بدنصیب دو سال سے شب و روز اس کا انتظار کرتی ہی ——"

چائے پیتے ہوئے اس نے بتلایا کہ بیوی کی اپنی بڑی جایداد تھی۔ جارج خود تاریخ کا معلّم تھا اور اس کے بیٹے کو پڑھاتا تھا۔ دونوں میں محبّت ہوگئی تو وہ اپنے شوہر کو جو ایک جرمن نواب تھا چھوڑ آئی۔ دِل جلے جرمن نے اس کی زندگی تباہ کرنے کے لاکھ جتن کیے اس کے باوجود دونوں کے اخلاص

میں فرق نہ آیا۔

یہ قصہ سُناتے وقت اس کی نگاہ اس طرح سمٹ گئی تھی گویا وہ کوئی بدخط دستاویز پڑھ رہا ہو یا اندھیرے باورچی خانے میں کسی چیز کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُبلتی ہوئی چائے کے گھونٹ لیتے وقت اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا اور آنکھیں تھیں کہ اضطراب کی وجہ سے لگاتار جھپکتی جاتی تھیں۔

اس نے دوبارہ پوچھا۔ " آخر تم ہو کون؟ . . . اچھا، سمجھا۔ تم نان بائی ہو، مزدور ہو۔ لیکن تم مزدور نہیں لگتے۔ پھر اس بوالعجبی سے کیا مطلب؟ "

اس کے لہجے میں اُلجھن تھی۔ اور جب اس نے مشتبہ انداز سے مجھے دیکھا تو ایسا لگا کہ یہ کسی صیاد دیدہ پرندے کی نظر ہو۔

میں نے مختصراً اسے اپنا حال سُنایا۔

اب اس کی آواز نرم پڑ گئی۔ " تو یہ بات ہو۔ —— تم نے مطبخ کے بدصورت بچّے کا قصہ پڑھا ہو؟ "

یک بہ یک اس کا چہرا غضب آلود ہوگیا اور وہ عالمِ جوش میں اِس زور سے بولنے لگا گویا چیخ رہا ہو۔

" وہ قصہ بے معنی نہیں۔ تمھاری عمر میں میں بھی اپنے کو راج ہنس سمجھتا تھا۔ میرا باپ پادری تھا۔ اور جب اس کا کہا نہ مان کر میں مدرسۂ دینیات کی بجائے یونی ورسٹی میں داخل ہوگیا تو اس نے مجھے عاق کر دیا۔ پیرس میں میں نے انسانیت کی ترقّی کی تاریخ پڑھی۔ سچ پوچھو تو یہی ترقّی دُنیا کی بدبختی کی واحد ذمّے دار ہو۔ "

کرسی سے اُچھل کر اس نے کان لگا کر کچھ سُنا اور پھر کہنے لگا:

"ہمارے آنسو پونچھنے کے لیے ترقّی کا افسانہ تراشا گیا ہے، ورنہ سچ پوچھو تو غلامی کے بغیر ترقّی ناممکن ہے۔ انسانیت ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک اکثریت پر اقلیت کی حکومت نہ ہو۔ پھر زندگی کا کیا مقصد رہ گیا۔ اسے آسان کرنے جائیے تو نئی نئی اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں اور مصیبت کم ہونے کی بجائے، بڑھ جاتی ہے۔ مشینوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور اسی اعتبار سے مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی جاتی ہے۔ دنیا کو صرف کسان کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات جتنی کم ہوں وہ اُتنا ہی آزاد اور خوش ہوگا۔"

پہلی مرتبہ یہ خیالات مَیں نے سُنے اور ان کے اثر کی خاص وجہ ان کا تند و تلخ پیرایۂ اظہار تھا۔ میرے میزبان نے سہم کر خوابگاہ کے دروازے کی طرف دیکھا اور اُدھر سے اطمینان ہونے پر اُسی بوکھلائے ہوئے انداز میں کہنے لگا:

"تم نہیں دیکھتے کہ انسان کی ضروریات کتنی مختصر ہیں؟ روٹی کا ایک ٹکڑا اور عورت کا آغوش ———"

عورت کا تذکرہ وہ رازدارانہ سرگوشی میں کرنے لگا۔ اور الفاظ و اشعار کا وہ طومار باندھا جو کبھی سُننے میں نہ آیا تھا۔ گرہ کٹ بشکن کی مورت آپ ہی آپ سامنے آگئی۔

اس نے عشق کے مارے بادشاہوں اور شاعروں کے ساتھ عصمت فروش حسیناؤں کی حکایت چھیڑ دی اور بیچ بیچ میں بڑے تاؤ بھاؤ سے فرانسیسی کے شعر سُنانے لگا۔

"دُنیا پر محبّت اور بھوک کی حکومت ہے" ——— اس کی زبان سے یہ

جملہ نکلتے ہی مجھے یاد آیا کہ ایک انقلابی کتابچے کے سرنامے پر یہی تحریر چھپی ہوئی تھی۔

"لوگوں کو علم نہیں بلکہ تجاہل اور تسکین کی چاہت ہے" — اس خیال میں بہت بڑی حقیقت پوشیدہ تھی۔

جب مَیں نے اس سے رخصت لی تو پو پھٹ چکی تھی۔ طوفان کا زور اب تک نہ گھٹا تھا اور فضا نے کُہر کی نقاب پہن رکھی تھی۔ ہوا کے تھپیڑوں میں مجھے اس بدبخت کے شکوے کی صدائے بازگشت سُنائی دینے لگی اور محسوس ہوا کہ اس کی باتیں میرے گلے میں پھنس کر دم گھوٹ رہی ہیں۔ تنور خانے جانے کو جی نہ چاہا۔ اور مَیں یوں ہی تاتار محلّے میں سرگشت کرنے نکل گیا۔ میرے جوتوں میں برف کے تودے چپکے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں مَیں اس وقت تک پھرتا رہا جب تک کہ دِن کا اُجالا پھیل نہ گیا اور انسانوں کی مورتیں برف کے ہیولا میں چلتی پھرتی نہ نظر آنے لگیں۔

اس متوالے فلسفی سے مَیں پھر نہ مِلا اور نہ مِلنے کو جی چاہا۔ لیکن اس کے بعد بارہا زندگی کی بے ثباتی اور جدّ وجہد کی ناکامی پر مَیں نے مختلف لوگوں کے وعظ سُنے جن میں راہ چلتے گنوار اور بے گھرے آوارہ منش ہی نہیں بلکہ طالس طائی کے چیلے اور بڑے بڑے عالم فاضل بھی شامل تھے۔ بعینہٖ یہی خیالات مَیں نے پادری، اُستادِ دینیات اور کیمیاداں کی زبانی سُنے۔ لیکن ان کا مجھ پر وہ اثر کبھی نہیں ہوا جو پہلے پہل ہوا تھا۔

اس واقعے کے تیس سال بعد غیر متوقّع طور پر یہی باتیں مَیں نے ایک بوڑھے مزدور سے سُنیں جو میرا قدیمی آشنا تھا۔ ایک بار اس سے میری

کھُل کر باتیں ہوئیں۔ اور اس نے ایسی صاف دلی سے جو صرف روسیوں کا حصّہ ہے، مجھ سے کہا:

"بھائی گورکی، مَیں زندگی سے کچھ نہیں مانگتا۔ ادب، سائنس، اور ہوائی جہاز جیسی چیزیں میری نظر میں بے معنی ہیں۔ مجھے ایک گوشۂ تنہائی چاہیے اور ایک عورت، جس کے لب میرے بوسوں کے لیے ہمیشہ حاضر ہوں اور اس کی رُوح وجسم جو میری ہستی سے ہم آہنگ ہوں۔ اور سب چیزیں غیر ضروری ہیں۔ تم پڑھے لکھوں کی سی حجّت کرتے ہو۔ اب تم ہمارے نہیں رہے۔ تم ایک سڑی ہوئی موری ہو کیوں کہ تمھاری رائے میں خیال انسان سے زیادہ اہم ہے۔ یہودیوں کی طرح تُم بھی سمجھتے ہو کہ انسان نماز پڑھنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔"

"یہودی تو یہ نہیں کہتے "

"صرف ابلیس کو معلوم ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں کیوں کہ اس قوم کی تھاہ پانا مشکل ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ پانی میں پھینک دیا اور اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

یہ پت جھڑ کی ایک چاندنی رات کا ذِکر ہے۔ ہم دونوں دریائے نیوا کے کنارے پتھر کی چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے ــــــ سارا دِن ہم نے کوئی نیک اور مفید کام کرنے کی بے کار کوشش میں گزارا اور اس کی وجہ سے ہم پر لاحاصل ہیجانی کیفیت طاری تھی۔

میرے ساتھی نے سوچتے ہوئے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا:

"میرا یہ مطلب نہیں کہ تم ہمارے مخالف ہو بلکہ یہ کہ تم ہم میں سے نہیں ہو۔ پڑھے لکھوں کو بے قراری میں لُطف آتا ہے کیوں کہ زمانۂ قدیم

سے اس طبقے کا خاصہ بغاوت ہے۔ عیسیٰ بھی خواب پرست تھا اور خیالی مقاصد کے لیے اس نے بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ آج کل کے اہلِ علم بھی کسی خیالی دنیا کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں۔ سماج کے تمام نکھلے اور بدمعاش ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں کیوں کہ موجودہ نظام میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں اور وہ اس سے انتقام لینے کے درپے رہتے ہیں۔ مزدور بھی انقلاب کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوں گے تاکہ دولت کی تقسیم میں انھیں برابر کا حصّہ ملے۔ لیکن جب ان کے ہاتھ میں طاقت ہوگی تو کیا وہ حکومت کا بار اُٹھانے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟ ہرگز نہیں! ان میں سے ہر ایک اپنی راہ لے گا اور کوئی کسی کی بات نہ پوچھے گا۔ تم کہو گے کہ مشینوں کے علم کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے ہمارے گلے کا پھندا زیادہ مضبوط ہو جائے گا اور پیروں کی بیڑی زیادہ کس جائے گی۔ اصل میں ضرورت اس امر کی ہے کہ غیر ضروری محنت بند کردیں انسان کو آرام کی ضرورت ہے اور اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ کیوں کہ سائنس اور کارخانے ہمیں یہ برکت نہیں بخش سکتے۔ مجھے صرف ایک جھونپڑی چاہیے پھر میں کوئی شہر کیوں بناؤں۔ اگر لاکھوں انسان ایک ساتھ رہیں تو انھیں بجلی، گندی نالی اور بازار سبھی کی حاجت ہوگی۔ ان بندھنوں سے چھٹکارا حاصل کرکے دیکھو تو زندگی کس قدر آسان ہو جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے نظام میں غیر ضروری اشیا کا انبار لگا ہوا ہے اور یہ لعنت علم کی پیدا کی ہوئی ہے اسی لیے میں پڑھے لکھوں کو سوسائٹی کا دُشمن سمجھتا ہوں۔"

جواب میں میں صرف یہ کہہ سکا کہ روسیوں کی طرح کوئی اپنی زندگی کو اس بُری طرح ضائع نہیں کرتا۔

میرے دوست نے مسکرا کر کہا "اس کے باوجود دُنیا میں ہم جیسا

کوئی آزادمنش نہیں - بھائی، غصے ہونے کی بات نہیں - مَیں ان لاکھوں کروڑوں بے زبانوں کی ترجمانی کر رہا ہوں جو ان خیالات کو صحیح تصوّر کرتے ہیں - اگر ہم زندگی کو آسان بنادیں تو بہت سی بُرائیاں خود بہ خود دُور ہو جائیں"

یہ نہ سوچنا چاہیے کہ یہ مفکّر طالس طائی کا حامی تھا - وہ مزاج کو پسند نہ کرتا تھا - مجھے اس کے روحانی ارتقا کا پُورا پُورا علم ہے -

اس گفتگو کے بعد مَیں اِس ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہو گیا کہ کیا میرے بے شمار اہلِ وطن صرف اس لیے انقلاب کی پُرپیچ وادیوں میں بھٹک رہے تھے کہ وہ محنت سے تھک کر آرام کے جویا تھے - یہ حقیقت ہے کہ کم ازکم محنت اور زیادہ سے زیادہ آرام کا تصوّر مقناطیس کی سی کشش رکھتا ہے -

---

گو کہ دیری نکوف کی دُکان سے بہت معمولی نفع ہوتا تھا، لیکن ان لوگوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جاتی تھی جو مالی امداد کے محتاج تھے -

میرے دوست آندرے دیری نکوف نے اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا:

"ان کی مدد کا کوئی طریقہ سوچنا چاہیے -"

اس غریب کا سارا وقت دُوسروں کی خدمت میں گزر جاتا تھا - اور گو وہ اپنی قسمت پر قانع ہو گیا تھا تاہم کبھی کبھی یہ خیال اس کے دِل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا - اکثر مَیں اپنے کو یہ پُوچھنے سے باز نہ رکھ سکتا تھا کہ "تم یہ سب کیوں کرتے ہو؟"

میرے سوال کے مافیہ کو سمجھنے میں وہ ہمیشہ غلطی کرتا - اور جواب میں عوام کی بدحالی اور تعلیم و ترقّی کی ضرورت پر لمبی لمبی تقریریں کرنے لگتا -

ایک مرتبہ مَیں نے پوچھا "کیا عوام کو علم کی چاہت ہے اور کیا وہ اس کے

بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ؟"

دیری نکوف نے کہا "اس میں کیا شک ہے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے؟"

مَیں تو سب کچھ چاہتا تھا لیکن متوالے فلسفی کا یہ جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا "انسانوں کو علم کی نہیں، خود فراموشی اور تسکین کی ضرورت ہے۔"

لیکن سترہ سال کے چھوکروں پر ایسا تیکھا طنز نہیں پھبتا۔ اور پھر اس قسم کے ماحول میں یہ نعرہ صدا بہ صحرا ثابت ہوتا۔ یوں بھی کسی کے عقیدے پر چوٹ کرنا کہاں کی شرافت ہے۔

ایک خاص چیز کی طرف میرا دھیان اکثر جاتا تھا۔ یہ کہ لوگ ہر دل چسپ قصّے کو کان لگا کر سُنتے تھے۔ اس لیے کہ گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے وہ زندگی کی تلخی کو بھول جاتے تھے۔ جو داستان جتنی زیادہ ہوش رُبا ہوتی وہ اتنی ہی توجہ سے اسے سنتے۔ اور جس میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے ہوں اسے وہ سب سے زیادہ دِل چسپ تصوّر کرتے تھے۔ ان سب باتوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا کہ مَیں کسی منجھ دھار میں بہا چلا جا رہا ہوں۔

ایک بار دیری نکوف کو سُوجھی کہ نان بائی کی دُکان کھولی جائے کیوں کہ اس کے حساب سے اس میں کم از کم پانچ آنے فی رُپے کا نفع لازمی ہے۔ نان بائی کے نائب کے علاوہ دیری نکوف کے منیجر کی خدمت بھی میرے سپرد ہونے والی تھی تاکہ وہ مردِ خدا گھی یا شکر چٹ نہ کر جائے۔

چناں چہ مَیں اس عجیب و غریب مکان سے منتقل ہو کر ایک ایسی کوٹھری میں رہنے لگا جو قدرے صاف تھی۔ اس کی صفائی مجھے ہی کرنی پڑتی تھی۔ میرا شمار چالیس نوکروں میں نہ ہوتا تھا بلکہ مَیں براہِ راست نان بائی کا بازوے راست قرار پایا۔ اس کا چہرہ انجیر کی طرح سوکھا ہوا اور

دھنوئیں سے مرجھایا ہوا تھا۔ کن پٹی پر سفید بالوں کی لٹیں چھٹی ہوئیں، نوک دار داڑھی اور کالی کالی آنکھیں کسی خیال میں کھوئی ہوئیں، اور دہانہ کسی گھونسلے کے منھ کی طرح چھوٹا سا۔ اس پر طرفہ یہ کہ موٹے موٹے ہونٹ یوں پھیلے ہوے تھے گویا تصوّر میں کسی کا بوسہ لے رہے ہوں۔ آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک کرن جگ مگاتی ہوئی جس میں طنز تیر رہی تھی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ چور تھا۔ پہلی رات کو ہی اس نے ڈیڑھ سیر سوجی، بہت سا مکھن اور دس انڈے ایک طرف نکال کر رکھ دیے۔

مَیں نے پوچھا "بھئی ان کا کیا ہوگا؟"

اس نے مسکراکر کہا "یہ ایک موہنی مورت کو دیا جائے گا۔ ایسی سُندر ہو —— ایسی تڑاق پڑاق ——"

مَیں نے اسے سمجھانا چاہا کہ چوری گناہ ہے۔ لیکن نہ تو میرے الفاظ میں زور تھا اور نہ میرے دلائل میں قوت۔

آٹا گوندھتے ہوے اس نے کھڑکی میں سے دیکھتے ہوے آسمان کے تاروں کو مخاطب کر کے حیرت سے بڑبڑانا شروع کیا۔ "یہ لونڈا چلا ہے مجھے سبق پڑھانے! کرآمدی دکی بیرشدی! میرے پوتے بھی عمر میں اس سے بڑے ہوں گے۔ کیسی عجیب بات ہے! ارے تجھے تو مَیں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔ پہلے تو کہاں کام کرتا تھا؟ سمونوف کی دُکان پر؟ - تو نے ہی وہاں بغاوت کروادی تھی؟ نہیں؟ —— ہو نہ ہو مَیں نے تجھے خواب میں دیکھا ہوگا۔"

چند روز میں مَیں نے معلوم کیا کہ نیند اس کی باندی تھی جو ہمیشہ ہاتھ باندھے حکم کی منتظر رہتی تھی۔ وہ کھڑا ہو بیٹھا ہو یا جھکا ہوا ہو ہر حالت میں، ہر وقت

سو سکتا تھا۔ سوتے وقت اس کی بھنویں تن جاتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ طنز سے تعجّب کا اظہار کر رہا ہے۔ بیتے ہوئے سپنوں یا چھپے ہوئے دفینوں کے ذکر میں اسے خاص مزا ملتا تھا۔ وہ یقینی طور پر کہنے لگتا ہیں زمین کے آر پار دیکھ سکتا ہوں۔ وہ سونے رُوپے سے بھرپور ہے۔ ہر جگہ دولت کے انبار گڑے ہوئے ہیں۔ مجھے اکثر اسی قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔ کبھی دیکھتا ہوں کہ غسل خانے کے کونے میں چاندی کے ڈبے دفن کیے ہوئے ہیں۔ فوراً اُٹھ کر راتوں رات کھدائی کرنے لگتا ہوں۔ گز بھر کھودنے کے بعد وہاں ہڈیاں اور آگ کی چنگاریاں برآمد ہوتی ہیں۔ ہیں سوچتا ہوں کہ اب کسی طلسم کا انکشاف ہونے والا ہے۔ اُسی وقت ایک دھماکا ہوتا ہے اور در و دیوار کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ ایک چڑیل کی ہیبت ناک چیخ فضا میں گونج اُٹھتی ہے —— 'چور چور۔ دوڑو، پکڑو۔' ہیں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ آتا ہوں ورنہ میری روح بھی وہیں خس و خاشاک ہو جائے۔

یہ نان بائی (لٹونن) بھول کر بھی نہ ہنستا تھا۔ البتّہ کبھی کبھی اس کی آنکھیں مسکرا اُٹھتیں اور نتھنے پھول جاتے تھے۔

اس کے خوابوں میں کوئی جدّت نہ ہوتی تھی۔ وہ روزمرّہ کے واقعات کی طرح بے رنگ اور بے معنی ہوتے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ وہ سچّے واقعات کو چھوڑ کر ان جھوٹے سچّے خوابوں کو اس قدر جوش و خروش سے کیوں دُہرایا کرتا ہے۔

ایسا نہیں کہ شہر میں کچھ ہوتا ہی نہ ہو۔ ایک امیر بیوپاری کی لڑکی نے جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی گئی تھی، نکاح کے فوراً بعد گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیا۔ ہزاروں جوانوں نے اس کے جنازے کو کاندھا دیا۔

اس کی قبر پر طالب علموں نے دھنواں دھار تقریریں کیں اور انھیں منتشر کرنے کے لیے پولیس کو بُلانا پڑا۔ ہمارے تنور خانے کے باہر ہر کس و ناکس اس الم ناک سانحے پر رائے زنی کر رہا تھا۔ پڑوس کی دُکان میں نوجوان بیٹھے والدین اور دولھا کو کوس رہے تھے۔ لیکن لٹونن نے پھوٹے منھ بس یہ کہا۔ "اس لڑکی کو اس کے ماں باپ نے بڑی ڈھیل دے رکھی تھی" اور پھر اس نے فوراً مجھے اطلاع دی "خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ تالاب میں مچھلیاں پکڑ رہا ہوں۔ اسی وقت ایک پولیس والا آدھمکا اور للکارا کہ اس دیدہ دلیری کی سزا ابھی ملتی ہے۔ میں بغلیں جھانکنے لگا اور جب کوئی راہِ فرار نہ ملی تو پانی میں کود پڑا ——— اور اسی وقت آنکھ کھُل گئی!"

جہاں اس کے مشاہدے کی حد ختم ہوتی تھی وہاں حقیقی زندگی کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ مگر اسے یہ تاڑنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ نان بائی کی یہ دُکان جس کے پچھلے حصّے میں لڑکیاں بیٹھی کتابیں پڑھتیں اور کوئی کام نہیں کرتیں کسی نہ کسی راز کی پردہ داری ضرور کرتی ہے۔

دُکان کے پیچھے کے کمرے میں طلبہ آتے جاتے رہتے اور دیر تک بحث یا سرگوشی کیا کرتے تھے۔ ہمارا مالک تو کبھی کبھار آتا۔ اس کی غیر حاضری میں دُکان کا کرتا دھرتا میں ہی تھا۔

لٹونن پوچھنے لگا "کیا تم مالک کے بھائی بند ہو؟ یا اس کے داماد ہونے والے ہو؟ یہ بھی نہیں؟ تب تو بڑی عجیب بات ہے ——— اور یہ تو کہو کہ یہاں طلبہ کا جم گھٹ کیوں رہتا ہے؟ اچھا یہ لونڈے آنکھیں سینکنے آتے ہیں۔ لیکن میاں یہ چھوکریاں تو صورت حرام ہیں۔ انھیں دیکھ کر تو آنکھیں آجائیں یہ ہوسکتا ہے کہ لڑکے اس بہانے کیک پیسٹری کھانے آتے ہیں۔"

ہر روز صبح سویرے دُکان کے پچھواڑے ایک لڑکی نمودار ہوتی جس کی ٹانگیں بطخ کی سی تھیں۔ دُور سے ایسا معلوم ہوتا کہ کسی بوری میں تربوز بھرے ہوئے ہیں۔ کھڑکی کے سامنے والے گڑھے میں اپنی ننگی ٹانگوں کو جھلاتے ہوئے اور پے در پے جمہائیاں لیتے ہوئے وہ پکارتی "وانیا"!

اس کا سر رنگین شال سے ڈھکا ہوتا۔ اور اس کے نیچے سے گھونگھر دار بالوں کے گچھے ماتھے اور کلّوں کی بلائیں لیتے ہوئے۔ انتہائی کاہلی سے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے بالوں کو منہ پر سے ہٹاتی اور اس وقت محسوس ہوتا کہ اس کی انگلیاں کسی نوزائیدہ بچّے کی انگلیوں سے ملتی ہوئی ہیں۔ مَیں سوچ میں پڑ جاتا کہ اس قسم کی لڑکی سے کس موضوع پر گفتگو ہوسکتی ہے۔

مَیں نے نان بائی کو جگایا۔ اور اس کی زبان سے پہلا جملہ یہ نکلا:

"کیا تم آگئیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

"تم سوئی تو تھیں؟"

"تو پھر اور کیا کرتی"۔

"تم نے خواب میں کیا دیکھا؟"

"اب کیا وہ یاد رہ گیا"۔

خاک روب کی جھاڑو اور پرندوں کے چہچہوں کے سوا شہر میں مکمل سنّاٹا تھا۔ جاگتے ہوئے سورج کی نئی کرنیں کھڑکی پر جھلملا رہی تھیں۔ اور روزِ روشن کا یہ آغاز مجھے دِل سے پسند آیا۔ کھڑکی سے نان بائی کا بازو باہر نکلا اور لڑکی کی پنڈلیوں کو گدگدانے لگا۔ اس لگاوٹ کا لڑکی پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اسی طرح منہ بنائے آنکھیں مٹکاتی ہوئی بیٹھی رہی۔

نان بائی نے مجھ سے کہا: "میکسم تنور میں سے کیک نکالنا ہو۔"

میری آنکھ بچتے ہی نان بائی نے آٹھ دس نان خطائیاں اور بسکٹ لڑکی کے لہنگے میں اُچھال دیے۔ اس نے ایک گرما گرم بسکٹ منھ میں بھر لیا اور جب زبان جلی تو آئی اوئی کرنے لگی۔ نان بائی نے للچائی ہوئی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے اوپری دِل سے کہا:

"اری بے حیا، لہنگا تو نیچا کر لے۔"

جب وہ چلی گئی تو نان بائی نے کہا "یار، مَیں عورتوں کے قریب بھی نہیں جاتا، تازہ بہ تازہ کنواریوں کا رس چوستا ہوں۔ یہ میری تیرھویں رکھیلی ہو۔ پولیس کے اس بُل ڈاگ کی منھ بولی بیٹی۔"

اس کی بکواس سُن کر مَیں اس اُدھیڑ بُن میں پھنس گیا کہ کیا میری زندگی بھی اسی طرح گزرے گی۔

تنور صاف کر کے میں ایک درجن ڈبل روٹیاں دیری نکوف کی دُکان پہنچاتا۔ بعد ازاں ایک بہت بڑے ٹوکرے میں من بھر روٹی اور کیک دینیات کے اسکول میں لے جاتا جہاں ناشتے کے وقت بے صبری سے میری آمد کا انتظار ہوتا تھا۔ طعام خانے کے دروازے پر کھڑا ہو کر مَیں طلبہ سے نقد اور اُدھار کا حساب کرتے ہوئے طالس طائی کے متعلق ان کے خیالات سُنا کرتا کیوں کہ ان کا ایک پروفیسر اس مصنّف کا بہت بڑا مخالف تھا۔ بسا اوقات ٹوکری کے نیچے کتابیں چھپی ہوتیں جنھیں مَیں چپ چاپ کسی کو دے دیتا۔ اور کبھی طلبہ سے کاغذات اور کتابیں لے کر اس میں چھپا لیتا۔

ہفتے میں ایک بار مجھے پاگل خانے کا گشت کرنا ہوتا۔ جہاں طلبہ دیوانوں کا مشاہدہ کرتے اور ان کے متعلق تقریریں سُنتے تھے۔ ایک مرتبہ

ں نے کسی خبط الحواس کو دیکھا جو اپنے دراز قد پر ایک لمبی سی ٹوپی اوڑھے
ے تھا۔ اس ہیئت کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی لیکن جب وہ قریب آکر
گھورنے لگا تو مَیں ڈر کے مارے دبک گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس
آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر میرے دل و جگر کو جلا رہی ہیں۔ ایک
فیسر بڑی نرمی سے اس مریض سے باتیں کر رہا تھا اور تمام وقت میں
نے چہرے کو یوں سہلاتا رہا گویا وہ گرمی سے جُھلس گیا ہو۔

یہ مریض بڑی گمبھیر آواز میں بول رہا تھا اور ڈرا دھمکا کر اپنا کوئی مطالبہ
تا چاہتا تھا۔ دورانِ گفتگو میں اپنے لمبے ہاتھ کی لمبی لمبی انگلیوں کو یوں
لاتا تھا گویا اس کا جسم خود بہ خود لمبا ہو رہا ہو اور اس حد تک لمبا ہو جائے گا
ہیں کھڑے کھڑے وہ اپنا بازو میرے پاس پہنچا سکے گا اور میری گردن کو
گرفت میں لے سکے گا۔

اس کے سوکھے ہوئے چہرے پر آنکھوں کے نیچے بڑے بڑے حلقے
۔ اور ان سے جو شعلہ بار نظریں نکلتیں انھیں دیکھ کر دل دہل جاتا
کم وبیش بیس طالب علم اس کا معائنہ کر رہے تھے اور ان سب کی نگاہیں
کے آگے جُھکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند مسکرا رہے تھے لیکن اکثر
ں اور مغموم تھے۔ اس میں شک نہیں کہ دیوانے کی سج دھج ہیبت ناک
ایسی خاموشی تھی کہ اُستاد کی آہستہ آواز بھی صاف سُنائی دیتی تھی۔
کے ہر سوال پر دیوانہ چیخ پڑتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی آواز
ہ سے نہیں بلکہ تحت الثرا یا عالمِ بالا سے آرہی ہو۔ اس کی چال
ں میں راہبانہ شان اور تمکنت تھی۔

راتوں کو مَیں اس دیوانے پر تُک بندی کیا کرتا جس میں اُسے میں نے

طان السلاطین' اور 'مشیرِ خدائے عظیم' کے القاب دیے تھے۔ بہت
ں اس کا خیال مجھے ستاتا رہا اور مدتوں بعد میں اس کی یاد اپنے دِل سے
سکا۔

شام سے لے کر دوپہر تک میں کام میں لگا رہتا اور دِن کا باقی وقت
تے گزر جاتا۔ لہٰذا کام کے دوران میں آٹا گوندھتے وقت یا تنور میں آنچ
کا انتظار کرتے وقت میں تھوڑا بہت پڑھ سکتا تھا۔ جیسے جیسے میں کام
وہ سمجھنے لگا نان بائی کام سے جی چُرانے لگا۔ عذر یہ پیش کرتا کہ مجھے کام
ھار رہا ہے۔

کبھی کبھی وہ حیرت سے کہہ اُٹھتا "میاں تم جی لگا کر کام سیکھتے ہو۔ خدا
ے سال دو سال میں نان بائی بن جاؤ گے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ لیکن تم ابھی
نے کم عمر ہو کہ نہ تمھاری عزّت ہو گی نہ کوئی تمھارا حکم مانے گا۔"

کتابوں سے میری محبت اسے سخت ناگوار تھی۔ وہ ہمدردی سے مشورہ
ا کہ پڑھنے کے بدلے سویا کرو۔ لیکن یہ پوچھنے کی زحمت اس نے کبھی نہیں
کہ پڑھتے کیا ہو۔

وہ اپنے سپنوں، خیالی دفینوں اور چھوٹی ٹانگوں والی محبوبہ میں ہمیشہ مگن
کرتا تھا۔ جب وہ راتوں کو درشن دیتی تو نان بائی اسے آغوش میں لے کر
رگاہ میں آٹے کی بوریوں پر جا بیٹھتا۔ اور اگر سردی ہوتی تو ناک سکیڑ کر کہتا:
"برخوردار، آدھ گھنٹے ٹہل آؤ!"

باہر ٹہلتے ہوئے میں سوچا کرتا کہ اس محبّت اور اس اُلفت میں جس کے
کرے سے کتابیں بھری پڑی ہیں کتنا بڑا فرق ہے۔

میرے مالک کی بہن دُکان کے پیچھے کی ایک کوٹھری میں رہتی تھی۔

گو مَیں اس کے سماوار کے لیے روز پانی گرم کرتا لیکن حتی الامکان اس سے نظر بچاتا تھا۔ کیوں کہ اس کی طفلانہ نگاہوں سے اب بھی مجھ میں ویسی ہی بےچینی پیدا ہوتی تھی جس کا تجربہ مجھے پہلی ملاقات میں ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوتا کہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں مسکراہٹ چھپی ہوئی ہے اور اس میں ایک زہرآلود طنز پنہاں ہے۔

مجھ میں جسمانی وحشت کی زیادتی نے ایک قسم کا بھونڈاپن پیدا کر دیا تھا۔ جب مَیں کئی کئی من وزنی بوریوں کو یہاں سے وہاں اُٹھایا کرتا تو نان بائی ترس کھا کر کہتا:

"تم میں تین مردوں کی قوت ہے۔ پھر بھی سگھڑاپے کی کمی ہے۔ ہو تو چھریرے لیکن بیل معلوم ہوتے ہو ــــ"

اب تک مَیں درجنوں کتابیں ختم کر چکا تھا۔ شاعری سے مجھے خاص لگاؤ تھا۔ بلکہ اس فن میں خود بھی شُدبُد کہنے لگا تھا۔ لیکن جب زبان کھولتا تو اپنی ہی بولی بولتا اور گو مجھے احساس تھا کہ وہ بازاری اور گنوارو ہے لیکن اپنے پیچیدہ خیالات کے اظہار کا اور کوئی پیرایہ مجھے نہ ملتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی ناپسندیدہ امر کے خلاف مَیں جان بوجھ کر بھونڈے طریقے سے احتجاج کرجاتا۔

میرے متعدد اُستادوں میں ایک ریاضی کا طالب علم تھا۔ وہ اکثر نکتہ چینی کیا کرتا۔ "خدا جانے تم نے بات چیت کا یہ انداز کس سے سیکھا ہے۔ تم بولتے نہیں پتھر مارتے ہو۔" لیکن مَیں عام نوجوانوں کی طرح خودپسند نہ تھا۔ خوب سمجھتا تھا کہ کس قدر گنوار اور اُجڈ ہوں۔ میرے گالوں کی ہڈیاں تاتاریوں کی طرح اُبھری ہوئی تھیں اور مجھے اپنی آواز پر قابو نہ تھا۔

جب مَیں مالک کی بہن کو کوئل کی طرح ہر کس و ناکس سے آنکھیں لڑاتے

دیکھتا تو لامحالہ سوچتا کہ اس کی چٹک مٹک جسم کی نزاکت سے کس قدر متضاد ہے۔ اس کی چال ڈھال اور ناز و انداز میں دکھاوا ہی دکھاوا تھا۔ آواز میں الھڑپن تھا اور وہ جی کھول کر ہنستی تھی لیکن مَیں یہ سوچنے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکتا کہ وہ پہلی ملاقات کا نقش میرے دِل سے مٹانے کے لیے یہ ادا دِکھا رہی ہے۔ لیکن وہ یاد میرے لیے اس قدر عزیز تھی کہ مَیں اسے کسی طرح نہ بُھلا سکتا تھا۔ بلکہ مجھے اس یاد کو تازہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔

کبھی وہ پُوچھ بیٹھتی: "تُم کیا پڑھ رہے ہو؟"

مَیں ہاں ہوں کر کے ٹال دیتا مگر یہ معلوم کرنے کو ضرور جی چاہتا کہ آخر یہ کیوں پوچھ رہی ہے۔

ایک مرتبہ اپنی کوتاہ پا معشوقہ کو پیار کرتے ہوئے نان بائی نے متوالی آواز میں مجھے للکارا "غدارا یہاں سے منہ کالا کر'۔ تو مالک کی بہن کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ بیٹھا بیٹھا مکھیاں اُڑایا کرتا ہے اور باہر کے لونڈے۔"

مَیں نے طیش سے کہا کہ پھر ایسی بات زبان پر لائے تو ادھ سیرا کھوپڑی پر دے ماروں گا۔ اور گزرگاہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ دروازہ ادھ کُھلا تھا اور اندر سے لٹوئن کی آواز آرہی تھی:

"تُم کہتی ہو کہ مَیں خواہ مخواہ اس پر بگڑتا ہوں۔ یہ لڑکا اتنا پڑھتا ہے کہ اب اس کا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔۔۔۔"

گزرگاہ میں چوہے اُچھل کوُد مچا رہے تھے اور تنور خانے سے لڑکی کے کراہنے اور بلبلانے کی صدا آرہی تھی۔

مَیں باہر نکل کر سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ ہلکی ہلکی پُھہار پڑ رہی تھی لیکن ہَوا بند تھی اور اس میں جلنے کی سی بُو تھی جیسے جنگلوں میں آگ لگ رہی ہو۔

آدھی رات گزر چکی تھی اور سامنے کے مکان کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے ایک گیت کے بول فضا میں گونج رہے تھے ؎

آدم و حوّا کی چاہت دیکھ کر چاند تارے پیار سے ہنسنے لگے

میرے دل میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ مالک کی بہن ماریا اسی طرح میری گود میں ہوتی جس طرح وہ دونوں سینے سے سینہ ملائے ہوئے تھے۔ لیکن جسم کے ہر روئیں نے پکار کر کہا کہ یہ خیالِ خام قابلِ ملامت ہے ؎

شراب کی جولانی شباب کی تابانی

مٹا گئی جوانی ای کاش یہ نہ ہوتا

کسی کی گہری آواز نے اتنی طویل "ای کاش" کھینچی کہ مجھے سخت ناگوار گزرا۔ میں جھک کر کھڑکی کے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ پردوں کے پیچھے بھوری دیواریں دکھائی دیں جنھیں نیلے سرپوش میں ڈھکا ہوا لیمپ روشن کر رہا تھا۔ کھڑکی کی طرف منھ کرکے ایک لڑکی کچھ لکھ رہی تھی۔ سر اٹھا کر اس نے قلم سے ایک سرکش کاکل کو سنوارنے کی کوشش کی اور اس دوران میں آنکھیں بھینچ کر مسکرانے لگی۔ خط کو تہ کرکے اس نے لفافے میں رکھا اور اپنے لب سے چپکا کر میز پر پھینک دیا۔ پھر اپنی ننھی سی انگلی سے اس نے لفافہ اٹھایا۔ اس کی ابرو پہ بل آیا۔ لفافہ پھٹا، خط دوبارہ پڑھا گیا اور ایک دوسرے لفافے میں بند کیا گیا۔ خط کو اس نے ہوا میں ایسی لرزش دی گویا وہ سفید جھنڈی ہے۔ پھر وہ تالی بجاتی ہوئی کونے کے پلنگ کے پاس پہنچی۔ اپنی انگیا اتاری جس کے اندر سے سڈول شانے روشنی میں جگمگا اٹھے اور پھر میز پر سے لیمپ اٹھا کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان کے اطوار کا مشاہدہ خلوت میں کیجیے تو وہ پاگل معلوم

ہوگا۔ میں غور کرنے لگا کہ تنہائی کی حالت میں یہ لڑکی کیسی عجیب زندگی بسر کرتی ہے۔

اتنے میں ایک سُرخ بالوں والا طالب علم خواب گاہ میں داخل ہوا اور آہستہ سے کوئی ایسی بات کہی کہ لڑکی کے ہونٹوں پر شرمائی ہوئی مسکراہٹ آئی۔ اپنے ہاتھ اس نے پیچھے چھپا لیے اور اس کا جسمِ نازنیں تھر تھرا اٹھا اس کل منہے کا دخل در معقولات مجھے بہت بُرا لگا۔

اُدھر نان بائی کی معشوقہ اپنی ننھی ٹانگیں گھسیٹتی اور آئی اٹھی کرتی لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکلی۔ چلتے چلتے کہنے لگی "جاؤ تنور خانے"

خمیر اُٹھاتے ہوئے نان بائی کہنے لگا کہ میری محبوبہ ہمیشہ آرام دیتی ہے، کبھی نہیں تھکنے دیتی۔ یہ سُن کر میں سوچنے لگا کہ کیا کبھی مجھ پر بھی ایسی ہی واردات گُزرے گی؟ اور یہ محسوس ہوا کہ کوئی بہت بڑی مصیبت میرا انتظار کر رہی ہے۔

تنور خانے کا کاروبار ایسا چمکا کہ دیری نکوف اسے وسعت دینے کی تجویز کرنے لگا۔ اسے ایک شغل بہ کی بھی تلاش تھی۔ اور یہ سُن کر میں خوش ہوا کیوں کہ کام کے بارے ہلکان ہو گیا تھا نان بائی نے وعدہ کیا کہ نئے تنور خانے میں تمہارا مرتبہ نائب اعلا کا ہوگا اور میں سفارش کروں گا کہ تمہاری تنخواہ پندرہ رُبل ماہانہ سے کم نہ ہو۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے فائدے کی سوچ رہا ہے۔ کیوں کہ اس نکھٹو کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ اس کے برعکس میں ہنسی خوشی کام میں جُٹا رہتا تھا کیوں کہ معروفیت میرے ذہنی ہیجان اور شہوانی رُجحان کو دبائے رکھتی تھی۔ بس افسوس اس امر کا تھا کہ پڑھنے کا وقت نہ ملتا تھا۔

نان بائی کہا کرتا۔ "کتنی اچھی بات ہے کہ تم نے کتابوں کا پیچھا چھوڑ دیا۔ خدا کرے چوہے انھیں نوچ کھائیں یہ تو کہو تمھیں سپنے دکھائی دیتے ہیں یا نہیں؟ ضرور دکھائی دیتے ہوں گے، لیکن ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے کتنی عجیب بات ہے۔ اس میں ہرج کیا ہے ———۔"

جب وہ مجھ پر مہربان ہو گیا تھا بلکہ میری عزت بھی کرنے لگا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ آقا میرا سرپرست تھا۔ تاہم نان بائی ہاتھ کی صفائی دکھانے سے نہ چوکتا تھا۔

اس دوران میں میری نانی کا انتقال ہو گیا۔ سات ہفتے بعد چچازاد بھائی کے خط سے مجھے اس الم ناک سانحے کی خبر ملی۔ نانی کلیسا کی دہلیز پر کھڑی بھیک مانگ رہی تھی کہ گر پڑی۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور اسی صدمے سے وہ آٹھ دن بعد مر گئی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ بھیک مانگ کر یہ بوڑھی میرے سونیلے بھائیوں اور ان کی بہن کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی گو یہ سب جوان مسٹنڈے تھے۔ ان میں سے کسی نے نانی کے علاج کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔

خط کے آخر میں لکھا تھا "جنازے کے جلوس میں ہم سب کے ساتھ بھکاری بھی تھے جو اس کی دل سے عزت کرتے اور زار و قطار روتے بلکتے تھے۔ نانا جان بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انھوں نے ہم سب کو چلے جانے کا حکم دیا اور خود قبر کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم پیڑوں کی آڑ سے چھپ کر ان کی فریاد سنتے رہے اور سوچنے لگے کہ اس صدمے کا بار وہ زیادہ عرصے برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ لیکن خوب یاد ہے کہ میری روح

گویا کسی گرداب میں پھنس گئی۔ رات کو جب مَیں آنگن میں لکڑی کی ڈھیری پہ بیٹھ گیا تو بے اختیار جی چاہا کہ کسی ہم دم کو بتلاؤں کہ میری نانی کتنی نیک اور شریف تھی اور ساری بستی اسے اپنی ماں تصوّر کرتی تھی۔ لیکن میری بپتا سننے والا کوئی نہ تھا اور وہ نوالۂ سوختہ کی طرح میرے دِل میں جل جل کر راکھ ہو گیا۔

کئی سال بعد چیخوف کا ایک افسانہ پڑھ کر یہ زخم پھر تازہ ہوا۔ اس افسانے میں جو زندگی کی سچّی تصویر ہے بتلایا گیا ہے کہ بیٹے کی موت کے بعد ایک تانگے والا اپنے گھوڑے کو دردِ دل سُنا رہا ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے رونا آیا کہ دُکھ کے دِنوں میں اس کے پاس نہ گھوڑا تھا نہ کتّا۔ اور مجھ کم بخت کو خیال بھی نہ آیا کہ تنور خانے کے چوہوں کو ہی اپنی داستانِ غم سُناؤں جو اس زمانے میں میرے گہرے دوست بنے ہوئے تھے۔

پولیس مین نِک فورچ میرے اِرد گِرد کن کوّے کی طرح اُڑنے لگا۔ دیکھنے میں وہ شان دار تھا اور اس کے سر پر چاندی کے تار چمکا کرتے تھے۔ اس کی لمبی ڈاڑھی کا بانک پن قابلِ دید تھا۔ اور مجھے دیکھ کر وہ یوں چٹخارا بھرتا گویا مَیں کوئی تر نوالہ ہوں۔

وہ اکثر پوچھا کرتا: "میاں سُنا ہے کہ تُم کتابوں کے دِل دادہ ہو۔ کہو تو سہی کیسی کتابیں پڑھتے ہو۔ انجیل یا اولیائے کرام کے حالات؟"

جب مَیں جواب دیتا کہ یہ دونوں چیزیں میرے مطالعے میں رہ چکی ہیں، تو وہ سخت مایوس ہوتا۔

"ہوں ہوں ـــــ بہت خوب ان کا مطالعہ یقیناً سود مند ہے۔ لیکن کاؤنٹ طالس طائی کی کوئی تصنیف تو نظر سے نہیں گزری؟"

طالس طائی کی کئی کتابیں مَیں پڑھ چکا تھا لیکن ان میں سے کسی سے

پولیس مین کو دِل چسپی نہ تھی۔

وہ بولا: "ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ ہر ایرا غیرا ایسی چیزیں لکھ سکتا ہے۔ سُنا ہے کہ اس نے کلیسا کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مَیں بھی انھیں پڑھوں۔"

ان ضبط شدہ تحریروں کے قلمی نسخے مَیں بھی پڑھ چکا تھا اور مجھے وہ بے نمک لگی تھیں لیکن مَیں ایسا نادان نہ تھا کہ پولیس کے گرگوں سے ان کا ذِکر کرتا۔

اس قِسم کے سرِ راہے سلام وکلام کے بعد یہ گرگِ باراں دیدہ کہنے لگا کہ گھر آؤ اور میرے ساتھ چائے پیو۔

مَیں فوراً تاڑ گیا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ پھر بھی اس کے گھر جاتے مجھے جھجک نہ ہوئی۔ کئی سوجھ بوجھ والوں سے مشورہ کرکے مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ دعوت قبول نہ کرنے سے تنور خانے کے متعلق اس کا شبہ زیادہ ہو جائے گا۔

چناں چہ ایک روز مَیں نک فورچ کے دڑبے میں جا دھمکا۔ اس کے ایک تہائی حصّے کا احاطہ ایک تنور لیے ہوئے تھا۔ ایک تہائی حصّے پر ایک دوہرا پلنگ قابض تھا۔ باقی حصّہ میں نعمت خانہ دو کرسیوں اور میز کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی کے ساتھ ایک بنچ بچھی ہوئی تھی۔ اس پر وردی ڈٹائے ہوئے نک فورچ اس طرح بیٹھا تھا کہ کھڑکی بالکل چھپ گئی تھی۔ میرے پاس اس کی جواں سال بیوی لال گلال گال اور گدرائے ہوئے جوبن لیے بیٹھی تھی۔ اس کی گلابی آنکھوں میں شرارت اور مکاری کھیل رہی تھی۔

تھی اور دھیمی آواز سے غصّہ ظاہر ہوتا تھا۔

پولیس مین نے کہا: "مجھے خوب معلوم ہے کہ میری منھ بولی بیٹی تو خانے جاتی ہے۔ وہ بڑی فاحشہ اور بدکردار ہے۔ سبھی عورتیں بدکار ہوتی ہیں۔"

بیوی نے سوال کیا — "سب؟"

نک فورچ نے اپنے تمغوں کو یوں ہلاتے ہوئے جیسے گھوڑا اپنے ساز کو ہلاتا ہے فیصلہ کن انداز میں کہا: "سب کی سب"

پیالی میں چائے انڈیلتے اور ہونٹ چاٹتے ہوئے وہ بولا: "طوائف سے لے کر ملکہ تک ہر عورت فاحشہ اور بدکار ہوتی ہے۔ ملکۂ شبا لق و دق صحرا کا سفر طے کر کے حضرت سلیمان سے ملنے کیوں گئی تھی۔ اور یہی حال ہماری ملکہ کیتھرن کا تھا گو اسے 'اعظم' کا لقب دیا گیا تھا۔"

اس نے نہایت تفصیل سے سُنایا کہ اس ملکہ کی عیش گاہ میں کوئی لہار راتوں رات سپاہی سے جنرل کے منصب کو پہنچ گیا تھا۔ اس کی بیوی کان لگا کر یہ داستان سنتی رہی اور برابر ہونٹ چاٹ کر میز کے نیچے اپنی پنڈلی پیری ٹانگ سے گھستی رہی۔ نک فورچ خوش گفتار تھا اور الفاظ کے برمحل استعمال پر اسے قدرت تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے گفتگو کے موضوع کو ایسا پلٹا دیا کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔

"مثلاً یہاں کالج کا ایک طالب علم رہتا ہے جس کا نام گوری پلیٹ نف ہے۔"

بیوی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "وہ حسین تو نہیں لیکن ویسے اچھا ہے۔"

نک فورچ نے پوچھا: "کون؟"

"مسٹر پلیٹ نف"

بیوی میری ٹانگ میں اڑنگا لگا کر اپنے شوہر کو اشتعال دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن وہ مور کی طرح سینہ تان کر اپنے الفاظ سے گل کاری کرنے میں مصروف تھا۔ بیوی کی ڈھٹائی سے میرا خیال دوبارہ بنٹ گیا اور مجھے یاد بھی نہ رہا کہ وہ اپنی آواز دبا کر پُراسرار طریقے سے یہ کہنے لگا :

"سمجھتے ہو —— ایک پُرفریب زنجیر —" آنکھوں کو دہشت سے سمیٹ کر وہ غور سے مجھے گھورنے لگا۔

"روس کے زار کو ایک مکڑا سمجھو"

بیوی نے سہم کر کہا: "اوئی تم کیا بکنے لگے۔"

"چُپ رہ ری ناسمجھ۔ میں بات سمجھانے کے لیے مثال دے رہا ہوں تحقیر کے لیے کچھ نہیں کہتا۔ سماوار ہٹا لے . . . ."

بھنوّیں تان کر اسی رازدارانہ انداز میں وہ کہتا گیا :

"زارِ روس کے دِل و دماغ سے ایک غیر محسوس زنجیر نکلتی ہے اور وزیروں و افسروں کو اپنی لپیٹ میں پھانستی ہوئی ہر چھوٹے بڑے سرکاری ملازم سے گزر کر مجھ جیسوں تک اور ادنا سے ادنا سپاہی تک پہنچتی ہے۔ اس کی کڑیاں سلطنت کے مختلف محکموں کو یک جا کرتی ہیں اور حکومت کے شیرازے کو ہمیشہ برقرار رکھتی ہیں۔ لیکن عیّار و مکّار حکومتِ برطانیہ سے رشوت لے کر روسی، پول اور یہودی اس زنجیر کو توڑنے کا جتن کر رہے ہیں۔ اور بہانہ یہ تراشتے ہیں کہ وہ قوم کی ترقّی چاہتے ہیں۔"

میری طرف جُھک کر اس نے سختی سے کان میں کہا :

"اب تمھاری سمجھ میں آیا؟ میں تم سے اتنی باتیں کیوں کر رہا ہوں؟ صرف اس لیے کہ نان بائی تمھاری تعریف کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم نیک اور

جواب ملا: "ایک تو یہ کہ وہ مسٹر نہیں۔ جب وہ تعلیم ختم کرلے گا تو مسٹر کہلائے گا۔ تب تک وہ ایک معمولی طالب علم کہلائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس میں اچھائی کیا ہی؟"

"بس یہ کہ وہ جوان اور خوش مزاج ہی۔"

نک فورچ کا جواب یہ تھا "تماشے کے مسخرے بھی خوش مزاج ہوتے ہیں ——"

بیوی بولی: "لیکن وہ رُپیہ لے کر خوش مزاجی کا سوانگ کرتے ہیں۔"

"چپ رہو۔ دوسرے یہ کہ ہر کتا جوانی کا دعوا کرسکتا ہی۔"

"مسخرہ تو بندر ہوتا ہی۔"

"میں نے کہا کہ تم اپنی تھوتھنی بند کرو۔ سُن لیا؟"

"ہاں سُنا تو تھا۔"

"پھر زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں۔"

اپنی بیوی کی زبان پر تالا لگا کر پولیس مین میری طرف متوجہ ہوا۔

"پلیٹ نف سے میل جول بڑھاؤ۔ بڑا دل چسپ لڑکا ہی۔"

اس نے مجھے پلیٹ نف کے ساتھ بارہا بازار میں دیکھا ہوگا۔ اس لیے میں نے فوراً کہا:

"ہم میں پُرانا یارانہ ہی۔"

"اوہو —— تم ——"

اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ آگئی اور اس نے یوں کروٹ بدلی کہ تمغے جھنک اٹھے۔ لیکن میں چوکنا تھا کیوں کہ ان دِنوں پلیٹ نف کچھ انقلابی اشتہاروں کو سائیکلو اسٹائل کررہا تھا۔

ذہین ہو اور خرافات میں نہیں پڑتے۔ یہ بھی ہو کہ دن کو طالب علم تھائے تنور خانے میں اور رات کو دیری نکوف کی دُکان میں اڈّا جماتے ہیں۔ اگر اکّا دکا ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ لیکن جب ان کے پرے کے پرے ہوں سمجھتے ہو نا؟ مَیں طلبہ کے خلاف کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان میں سے کوئی ہونہار کبھی نہ کبھی افسر بھی بن سکتا ہو۔ بیش تر طلبہ نیک دِل ہوتے ہیں لیکن وہ جلد بازی میں ہر پھٹے میں ٹانگ اڑانے لگتے ہیں۔ زار کے دشمن ان سے ایندھن کا کام لیتے ہیں۔ سمجھے کچھ؟ ایک بات اور کہوں ——"

لیکن ابھی وہ یہ نیا ماجرا سُنانے بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ کھول کر ادھیڑ عمر کا ایک آدمی اندر گھُس آیا۔ وہ اپنے گھونگھریلے بالوں پر ایک چھوٹی سی ٹوپی منڈھے ہوے تھا اور شراب کے نشے میں چور بغل میں ایک بوتل دبائے ہوئے تھا۔

مسرت خیز لہجے میں وہ بولا: "ہو جائے چوسر کی ایک بازی۔" اور پھر اس نے ہنسی مذاق کا دفتر کھول دیا۔

نک فورچ نے چڑچڑے پن سے تعارف کرایا: "میرے سُسر ہیں"

اب جو مَیں رخصت ہونے لگا تو اس کی بیوی نے دروازہ بند کرتے وقت معنی خیز طریقے سے چٹکی لے لی۔ اور باتیں ملانے لگی۔ "بادل کیسے لال ہو رہے ہیں۔ گویا آسمان میں آگ لگی ہوئی ہو۔" لیکن اس وقت آکاش پر بادل کا صرف ایک ٹکڑا اور پھر وہ بھی چھوٹا سا —— اُڑ رہا تھا۔

اپنے اُستادوں کی تضحیک منظور نہیں۔ لیکن مجھے یہ ماننا ہی پڑتا ہو کہ نظامِ حکومت کی جتنی صاف اور آسان تشریح پولیس مین نے کی تھی

اور اس سے جو غیر مرئی تار نکلتے تھے وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ارتباط قائم کرتے تھے۔

شام کو دُکان بند کر کے مالکن نے مجھے بُلا بھیجا۔ اور کہنے لگی کہ پولیس مین کی گفتگو کی تفصیل معلوم کرنے کا فرض اس کے ذمّے کیا گیا ہے۔

میری رپٹ سُنتے وقت وہ سر ہلا کر چُہیا کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگی۔ آخر میں خوف و ہراس سے وہ پکار اٹھی: "خدا خیر کرے۔ وہ موا نان بائی تو تم سے راز کی باتیں معلوم نہیں کرلیتا۔ کیوں کہ اس کمینہ پولیس مین کی منھ بولی بیٹی اس کی رکھیلی ہے۔ اب تو اس نان بائی کو نکالنا ہی ہوگا۔"

مَیں دروازے کا ٹیکا لگائے حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے 'رکھیلی' پر جس طرح زور دیا وہ مجھے پسند نہ آیا اور نہ یہ خیال بھایا کہ نان بائی کو نکال دیا جائے۔

"ہمیشہ چوکس رہو" اس نے مجھے رائے دی۔ اور حسبِ عادت اس کی چِتون مجھ سے کوئی ایسا سوال پوچھنے لگی جس کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے بھی مَیں بے چین ہو جاتا تھا۔

میرے روبرو آکر اور ہاتھ پیچھے باندھ کر وہ پوچھنے لگی: "تم ہمیشہ منھ کیوں بنائے رہتے ہو؟"

"مجھے حال ہی میں اپنی نانی کے انتقال کی خبر ملی ہے۔"

یہ جواب اس کے دِل کو لگا: "کیا تم اسے بہت چاہتے تھے؟"

"ہاں۔ آپ کو اور کچھ پوچھنا ہے؟"

"نہیں۔"

وہاں سے آکر میں رات بھر تک بندی کرتا رہا۔ اور اس میں خدا جانے بار بار ٹیپ کا یہ مصرعہ کیوں گھس آتا تھا۔ ؎

تو نہیں وہ جو نظر آتی ہے

اب تنور خانے میں طلبہ کا آنا جانا بہت کم ہوگیا۔ اس سے مجھے یہ دقت ہوگئی کہ دورانِ مطالعہ میں جو مشکل آجاتی اُسے سلجھانے والا کوئی نہ رہا۔ لہٰذا اس قسم کے کٹھن سوال میں ایک کاپی میں نوٹ کرنے لگا۔ ایک مرتبہ لکھتے لکھتے میں تھک کر سوگیا اور نان بائی کو اسے کھول کر پڑھنے کا موقع مِل گیا۔

مجھے جگا کر اس نے پوچھا " تم یہ کیا لکھا کرتے ہو۔ گیری بالڈی[1] نے بادشاہت کا خاتمہ کیوں نہ کردیا۔ یہ گیری بالڈی کون سی بلا تھی۔ اور کیا بادشاہوں کا خاتمہ بھی کیا جاسکتا ہے؟"

غصے کے مارے اس نے میری کاپی کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دی۔

" بہت خوب۔ صاحب زادے کو بادشاہت کے خاتمے کا خبط سوجھا ہے۔ عجیب بات ہے۔ ان خرافات کو چھوڑو ~~آئے ہیں بڑے~~ پڑھنے والے۔ پانچ سال پہلے تم جیسے پانچ دیوانوں کو پولیس نے سارا توف میں گرفتار کیا تھا۔ میاں پولیس یونہی تم میں کیا کم دِل چسپی لیتی ہے جو بادشاہ کی مخالفت کا سودا سر میں سمایا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ ازراہِ شفقت وہ یہ سب کہہ رہا تھا۔ مجھے جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی کیوں کہ اُس سے 'خطرناک معاملات' پر گفتگو کرنے کی مجھے ممانعت کردی گئی تھی۔

ایک دن میں نے مویشیوں کے ڈاکٹر لامزوف سے ایک سنسنی خیز کتاب طلب کی جو شہر میں ہاتھوں ہاتھ گردش کررہی تھی اور ہر طرف گرما گرم بحثا بحثی

کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ اس نے سر ہلا کر کہا: "بھائی، یہ امر تو محال ہے۔ بُرا ماننے کی بات نہیں۔ لیکن ایک جگہ یہ کتاب پڑھ کر سنائی جائے گی اور میں وہاں تمھیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

چناں چہ آدھی رات کو ہم دونوں ایک فرلانگ آگے پیچھے اس ٹھکانے روانہ ہوئے۔ یہ علاقہ ویران تھا لیکن احتیاطاً میں کسی متوالے مزدور کی طرح گانا سیٹی بجاتا جا رہا تھا۔ اوپر کالے کالے بادل آوارہ گردی کر رہے تھے اور ان میں چاند کسی سنہری گیند کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ زمین سیاہ سائے میں ملبوس تھی۔ یہاں وہاں پانی کے گُنڈ چاندی کے پتّر کی طرح چمک رہے تھے۔ دُور سے شہر کے شور و غوغا کی آواز آ رہی تھی۔

میرا راہ بر دینیات کے مدرسے کے پیچھے باغ کے پاس جا کر رُک گیا۔ باغ کی باڑھ پر سے چپکے سے اُچک کر ہم اندر گئے۔ وہاں ہر طرف پیڑ پودوں کی فراوانی تھی اور جب ان کی ڈالیوں کو ہٹاتے ہوئے چلے تو پتّوں سے شبنم کی بوندیں ہم پر ٹپکنے لگیں۔

اندھیرے میں ایک مکان نظر آیا۔ اس کی بند کھڑکی پر ہم نے ہلکی سی دستک دی ہی تھی کہ ایک ڈڑھیل آدمی نے اسے کھول دیا۔ اندر مکمّل سنّاٹا تھا

"کون ہے؟"

"ہم یاکوف سے آئے ہیں۔"

"تو اندر آ جاؤ۔"

تاریکی میں کئی لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا کپڑوں کی سرسراہٹ چلنے کی آہٹ، کانا پھوسی اور دبی ہوئی کھانسی۔ کسی نے دیا سلائی جلائی تو میں نے دیکھا کہ فرش پر کئی آدمی بیٹھے ہیں۔

پیتل کی کوئی چیز اندھیرے میں عجیب طریقے سے جھلملانے لگی۔ مجھے سپاہیوں کے ٹوپ کا خیال آیا لیکن دراصل یہ تنوّر کا ہوادان تھا۔ اتنے میں کمرے میں ایسی سرگوشی ہونے لگی کہ تقریر اور تنقید میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔

"اگر آپ کہیں تو کتاب بند کردی جائے۔" یہ طنزیہ جُملہ اس زرد رُو جوان کی زبان سے نکلا جو کھڑکی میں بیٹھا تھا۔

پھر سنّاٹا چھا گیا اور قاری کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ بیچ بیچ میں دیاسلائی سلگتی تو غور و فکر میں محو چہرے یا کُھلی ادھ کُھلی آنکھیں دم بھر کے لیے اُجاگر ہوجاتی تھیں۔

گھنٹوں پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا اور سُنتے سُنتے میں تھک گیا۔ تاہم ان چُبھتے ہوئے تیز تیز فقروں اور لاجواب کردینے والی دلیلوں میں بڑا اثر تھا۔

یک بہ یک قاری خاموش ہوگیا اور کمرے میں ہر طرف سے واویلا اُٹھا:

"نامعقول کہیں کا"

"محض بکواس"

"شہیدوں کے خون کی یہ توہین——"

دوبارہ اسی جوان نے کڑک کر کہا:

"صاحبو، گالی گلوچ سے کیا فائدہ۔ تنقید میں بڑی سنجیدگی کی ضرورت ہے"

میں طبعاً تکرار اور بحث سے بچتا ہوں اور انھیں سُننا بھی پسند نہیں کرتا۔ کسی مشتعل دماغ کی واہی تباہی باتوں کو سمجھنے کا سلیقہ مجھ میں نہیں۔ بلکہ بحث کرنے والوں کی خود پسندی سُن کر مجھے خواہ مخواہ غصّہ آنے لگتا ہے۔

کھڑکی سے جھک کر اس جوان نے مجھے مخاطب کیا: "تم تو نان بائی میکسم ہو نا؟ میرا نام فیڈوسیف ہے۔ ہمارا تعارف ہو جانا چاہیے کیوں کہ یہاں

"سب آ گئے؟"

"ہاں"

"کھڑکی پر اچھی طرح پردہ کھینچ دو تاکہ باہر روشنی کی کرن بھی نہ جانے پائے۔"

کسی نے غصّے سے غرّا کر کہا "اس اُجڑے دیار میں ہم سب کو جمع کرنے کی حماقت کیوں کی گئی۔"

"بس اب چُپ رہو۔"

کونے میں مدھم سا چراغ روشن ہُوا تو معلوم ہوا کہ کمرے میں جھاڑو پھری ہوئی ہے۔ صرف دو صندوق تھے جن پر لکڑی کا پٹرا ڈال دیا گیا تھا اور اس پر پانچ آدمی اس طرح بیٹھے تھے گویا پیڑ پر کاکا توے بیٹھے ہوے ہوں۔ تین آدمی دیوار کا ٹیکا لگائے بیٹھے تھے اور ایک دُبلا زرد رُو نوجوان کھڑکی میں فروکش تھا۔ اس کے اور ڈڑھیل آدمی کے سوا اور سب کو مَیں پہچانتا تھا۔ اتنے میں ڈڑھیل نے کڑک کر کہا کہ مَیں ایک کتابچہ پڑھ کر سناؤں گا جس کا نام "ہمارے اختلافات" ہے اور وہ پلی خانوف[1] کا لکھا ہوا ہے۔

کسی بگڑے دل نے چمک کر کہا: "یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے۔"

یہ پُراسرار ماحول مجھ میں ایک لطیف بے کلی پیدا کرنے لگا کیوں کہ اسرار کی شاعری سے بہتر دنیا میں کوئی شاعری نہیں۔ مجھ پر ویسی ہی کیفیت طاری ہوگئی جس کا تجربہ کلیسا جا کر ہوتا ہے۔ کمرہ اس گہری آواز سے گونجنے لگا جو ہر لفظ کو صاف صاف ادا کر رہی تھی۔

کونے کی جانب سے پھر کوئی بڑبڑایا ——— "واہیات۔"

---

[1] PLEKHANOV روس میں مارکسیت کا پہلا علم بردار۔

بے کار وقت ضائع ہو رہا ہے۔ یہ بحث کبھی ختم نہ ہوگی۔ چلو، یہاں سے نکلیں
مَیں نے سُن رکھا تھا کہ وہ سنجیدہ مزاج نوجوانوں کے ایک حلقے کا لیڈ
ہے۔ اور اس کی ذہانت و تمکنت سے مَیں پہلی نظر میں ہی متاثر ہُوا۔

میدان میں ٹہلتے ہوئے وہ پُوچھنے لگا کہ مزدوروں میں کسی سے دو
ہے یا نہیں، کیا پڑھتے ہو اور کتنی فرصت مِلتی ہے۔

اس نے یہ بھی کہا "مَیں نے تمھارے تنور خانے کا ذِکر سُنا ہے۔ لیکن
سمجھ میں نہیں آتا کہ تم وہاں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ تمھیں اس کی ضر
بھی کیا ہے؟"

تھوڑے عرصے سے مَیں بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ میری محنت رایگا
ہو رہی ہے۔ جب مَیں نے اس کی تائید کی تو خوش ہو کر اس نے میرے ہاتھو
کو بھینچا۔ اور مُسکرا کر کہا کہ مَیں تین ہفتے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ واپسی
بعد تمھیں اطلاع دوں گا کہ کہاں اور کب ملاقات ہو سکتی ہے۔

ادھر تنور خانہ جتنی ترقی کر رہا تھا، میرے حالات بد سے بدتر ہو رہے
تھے۔ ہم نے ایک نئی دُکان لے لی تھی اور ساتھ ساتھ میرا کام بھی بڑھ گیا
تھا۔ تنور کے کام دھندے کے علاوہ مجھے جا بجا روٹیاں بانٹنی ہوتی تھیں
ان میں "رئیس زادیوں کا بورڈنگ ہاؤس" بھی تھا۔ ٹوکری سے روٹیاں نکا
وقت وہ میرے ہاتھ میں پرچیاں تھما دیتی تھیں۔ جب میں ان طفل کلامیو
کو پڑھتا تو حیرت کی انتہا نہ رہتی۔ جب سفید پوش اور روشن چشم لڑکیاں جھنڈ
باندھ کر میری ٹوکری کے اردگرد جمع ہوتیں اور ہنستی کھِل کھلاتی ہوئیں روٹیو
کو اپنی لال لال ہتھیلیوں میں نچاتیں تو مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جا

شرم ناک پرچیاں لکھ لکھ کر مجھے دیا کرتی ہے۔ خود بخود چکلے گھر کا خیال آتا اور
میں اپنے آپ سے، پوچھتا کہ کیا کوئی غیر مرئی زنجیر چکلا گھروں کو اس قسم کے
بورڈنگ ہاؤس سے وابستہ کرتی ہے۔

ایک بار کسی دوشیزہ نے جس کی نئی جوانی کا راز اس کی اُبھرتی ہوئی
چھاتی سُنا رہی تھی مجھے گزرگاہ میں روک کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا: "اگر
تم یہ خط لے جاؤ تو تمھیں چونّی دوں گی۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے، ہونٹ تھرتھرا رہے تھے
اور سارا چہرہ شرم سے لال ہوگیا تھا۔ مَیں نے شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے
چونّی لینے سے انکار کردیا۔ اور خط ایک منصّف کے لڑکے تک پہنچا دیا۔
یہ ایک دراز قد طالب علم تھا جس کے گالوں پر تپ دق کے آثار نمایاں تھے۔
اس نے بغیر کچھ کہے سُنے ایک رُپیہ میری طرف بڑھایا۔ وہ بھی اس طرح کہ
جیب سے اکنی دوانّی نکال کر انھیں احتیاط سے گنتا رہا۔ جب میں نے یہ
انعام لینے سے انکار کردیا تو اس نے یہ ریزگاری جیب میں واپس رکھنی چاہی
لیکن وہ جیب میں داخل ہونے کی بجائے زمین پر گر پڑی۔

وہ اُداسی سے ان آوارہ سکّوں کو تاکنے لگا جو ہر طرف لڑھکے
جارہے تھے۔ اور اپنے ہاتھ اس زور سے ملنے لگا کہ انگلیاں چٹخ پڑیں۔
لمبی سانس بھر کر وہ زیرِ لب بولا: "اب کیا کروں۔ اچھا، خدا حافظ۔
میں سوچ کر جواب دوں گا۔ ۔ ۔"

مَیں جواب کی نوعیت سے قاصر تھا۔ لیکن اس لڑکی پر مجھے ترس
آیا۔ کچھ دنوں بعد وہ اسکول سے غائب ہوگئی۔ پندرہ سال بعد جب
اس سے ملاقات ہوئی تو وہ کریسیا کے ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ تپ دق

میں مبتلا ہوگئی تھی اور اس کی گفتگو میں تلخی تھی وہ کہتی تھی کہ وہ زندگی کے ہاتھوں ستائی ہوئی ہے۔

روٹیاں بانٹنے کے بعد میں تنور خانے لوٹ کر سو جاتا تھا۔ شام کو اُٹھ کر پھر کام میں لگ جاتا تاکہ آدھی رات تک کیک پیسٹری تیار ہو جائے ہماری دُکان ناٹک گھر کے پاس ہی تھی اور کھیل ختم ہونے کے بعد تماشائی منھ میٹھا کرنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ تنور میں مال بھر کر میں آٹے میں خمیر اُٹھانے لگتا تھا اور سات آٹھ من آٹا گوندھنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ رات کے پچھلے پہر دو تین گھنٹے سونا مل جاتا تھا۔ صبح ہوتے ہی پھر وہی چکر شروع ہو جاتا تھا۔ غرض کہ روز کا یہی دستور تھا۔

اس کے باوجود میں اس خبط میں مبتلا تھا کہ ہر سو نیکی اور علم کی روشنی پھیلاؤں۔ یوں تو میں ملنسار تھا ہی اور پھر کہانی سُنانے کا خاص سلیقہ تھا۔ میں نے اپنی مختصر زندگی میں بہت اُلٹ پھیر دیکھے تھے اور بہت سی کتابیں بھی پڑھ چکا تھا۔ ان سے میرے تخیل کو بڑی مدد ملتی تھی اور ایک معمولی سے واقعے کو میں افسانے کی صورت دے سکتا تھا۔

اپنے ملاقاتیوں میں مجھے ’نکتیا‘ نامی بوڑھا جولاہا خاص طور پر پسند تھا۔ وہ روس کے تقریباً تمام پتلی گھروں میں کام کر چکا تھا۔ پتھرائی ہوئی آواز میں وہ کہتا: ”میکسم، میرے نونہال، میں ۷۵ سال تک جہاں گشتی کرتا رہا ہوں“۔ اس کی کمزور آنکھیں عینک کے پیچھے مسکرا اُٹھتیں۔ عینک کی کمانی تانبے کے تار سے بنائی گئی تھی جس کی وجہ سے ناک اور کن پٹی پر ہرے دھبے پڑ گئے تھے۔ دوسرے جولاہے اسے ’جرمن‘ کہہ کر پکارتے تھے کیوں کہ وہ ڈاڑھی منڈاتا تھا اور ہونٹوں کے اوپر نیچے تھوڑے سے بال چھوڑ دیتا تھا۔ اس کی گفتگو میں

مذاق کی ہلکی سی چاشنی ہوتی تھی۔

اپنی گنجی کھوپڑی کو بائیں کاندھے پر جھکا کر وہ کہتا "سرکس مجھے بہت بھاتے ہیں۔ جانوروں کو کس ہوشیاری سے سدھایا جاتا ہے۔ کیا بتلاؤں کہ ان سے مجھے کتنا اُنس ہے۔ ان کی ذہانت دیکھ کر دِل ہی دِل میں سوچتا ہوں کہ اگر حیوان یہ سب کچھ سیکھ سکتے ہیں تو انسان کیا نہیں کر سکتے۔ جانوروں کو شکر چکھا کر لبھایا جا سکتا ہے۔ اور یہ شکر بازار میں مل جاتی ہے۔ لیکن ہماری روح کو جس شکر کی ضرورت ہے وہ ہم دردی ہے۔ میاں، اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ڈانٹ پھٹکار کی نہیں بلکہ مہربانی اور ہم دردی کے مرہم کی ضرورت ہے۔"

اس بلند بانگ وعظ کے باوجود نکتنیا اپنے ساتھیوں سے اچھا سلوک نہ کرتا تھا۔ اس کی بات چیت حقارت اور تلخی میں سموئی ہوئی ہوتی۔ دلیل کی بجائے وہ تو تکار پر اُتر آتا اور اپنے مخالف کی توہین کرنے لگتا۔ اس سے پہلی ملاقات کسی شراب خانے میں ہوئی جہاں اس کی مارپٹائی کا پورا انتظام ہو چکا تھا اور دو چار دھول رسید بھی ہو چکے تھے کہ مَیں نے بچا لیا۔ بروقت مَیں بیچ بچاؤ کر کے اسے باہر نکال لایا۔

اندھیرا تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مَیں نے پوچھا "آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

اس نے اطمینان سے کہا: "یہ بھی کوئی چوٹ میں چوٹ ہے —— لیکن مجھے 'تم'، نہ کہہ کر 'آپ'، کیوں کہتے ہو؟"

اسی گھڑی ہماری دوستی پکّی ہو گئی۔ شروع شروع میں وہ میرا خوب مذاق اڑایا کرتا تھا۔ لیکن جب مَیں نے کہا کہ ایک 'مکڑی کا جالا' کس طرح ہماری زندگی کو اپنے تانے بانے میں لپیٹ رہا ہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اور بولا " تم ایسے بے وقوف نہیں ہو . . " بعد ازاں وہ مجھ سے پدرانہ شفقت سے پیش آنے لگا یعنی پیار کے عجیب وغریب القاب دینے لگا۔

" میرے پیارے ننھے سے چند میکسم، تمھارے خیالات صحیح ہیں لیکن انھیں کوئی نہ مانے گا اس لیے "

"تم تو انھیں مانتے ہو نا ؟ "

" میں نرا کتا، آوارہ کتا ہوں۔ اور سب گھریلو کتے ہیں جن کی دُموں میں مکھیوں کی طرح بال بچّے چپکے ہوئے ہیں۔ اور چوں کہ ہر کتے کو اپنا گھر پیارا ہے اس لیے کوئی تمھارا کہا نہ مانے گا۔ ایسی باتیں میں پہلے بھی سُن چکا ہوں اور ان کا انجام بھی دیکھ چکا ہوں۔ یاد رکھو کہ جو آگے آگے چلے گا اسی کے سر دولتی لگے گی۔ اور سر چوتڑ سے زیادہ نازک مقام ہے۔ اس کا زخم دیر میں بھرتا ہے۔"

جب قفل ساز یاکوف سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے اپنا طرزِ گفتگو بدل دیا۔ یہ نیک بخت گِٹار بجاتا تھا اور انجیل کا حافظ تھا۔ اس نے خدا کے وجود سے اس زور شور سے انکار کیا کہ نکتیا بھوچکا رہ گیا۔ یاکوف کے پھیپھڑے سڑ گئے تھے اور اکثر وہ خون تھوکا کرتا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ پوری شدت سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ انسان اور خدا کی صفات ہرگز ایک سی نہیں ہیں۔

" انسان نہ کچھ سمجھتا ہے نہ کچھ کرسکتا ہے۔ نہ اس میں کوئی نیکی ہے۔ یا تو خدا کو یہ سب کچھ معلوم نہیں اور اگر معلوم ہے تو اس کا مداوا اس کے پاس نہیں اور اگر اس میں قدرت ہے تو وہ ہماری اصلاح کی طرف سے بے پروا ہے۔ مختصر یہ کہ خدا نہ رحیم ہے نہ کریم اور نہ عظیم بلکہ ایک سِرے سے وہ غائب ہے

اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ خدا اور مذہب ہمارے تخیل کی اُپج ہیں اور میں ان کے فریب میں نہیں آسکتا۔

یہ تقریر سُن کر نکتیا سناٹے میں آگیا۔ اس کا چہرا غصے سے تمتما اُٹھا اور اس نے گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔ لیکن جب یاکوف نے اپنے دلائل کی حمایت میں انجیل کی آیتوں کا دونگڑا برسایا تو نکتیا کے چھکّے چھوٹ گئے اور وہ غور و فکر میں محو ہوگیا۔

بولتے وقت یاکوف ہیبت کا پُتلا بن جاتا تھا۔ اس کے زرد چہرے پر کالے گھونگھر دار بالوں کی بھرمار تھی اور نیلے ہونٹوں کے اندر سے بھیڑیے کے سے دانت چمکا کرتے تھے۔ تیز کالی آنکھیں جو مجھے اس دیوانے کی یاد دلاتی تھیں اپنے مخاطب کو ایسی سختی سے گھورنے لگتیں کہ اس کے لیے آنکھ مِلانا دوبھر ہوجاتا تھا۔

جب ہم یاکوف سے مِل کر لوٹنے لگے تو نکتیا نے چڑچڑے پن سے کہا: "آج تک میرے آگے کسی نے خدا کی ایسی مخالفت نہ کی تھی۔ سب کچھ سُنا لیکن ایسی نرالی بات کبھی نہ سُنی تھی۔ یہ آدمی زیادہ دنوں زندہ نہ رہے گا۔ افسوس کا مقام ہے۔ خدا کا نام آتے ہی اس کے منھ میں کف بھر آتا ہے۔ بہرحال اس میں بھی دِل چسپی کا پہلو ہے۔"

چند روز کے اندر دونوں میں بڑی دوستی ہوگئی۔ اب نکتیا اسے چھیڑنے کے لیے کہتا: "بہت خوب۔ ان حضرت کا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے منصب سے سبک دوش ہوگئے ہیں۔ یوں تو زار کے متعلق بھی لوگوں کی اپنی اپنی رائے ہوسکتی ہے۔ میری زندگی میں تو اس کے وجود سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے آرام یا تکلیف کا انحصار زار پر نہیں بلکہ ہمارے مالکوں پر ہے۔ میں تو بُرے سے بُرے زار سے بھی کہہ سکتا ہوں کہ تمھاری حکومت سے مجھے غرض نہیں۔

لیکن سالک کے خلاف مجھے جو شکایتیں ہیں ان کا سدِ باب کرو۔ اگر تم ایسا کر دوگے تو مَیں تمھیں ہمیشہ خراج دوں گا اور درازیٔ عمر کے لیے دُعا کروں گا۔"

علم سے اُسے بے پایاں محبّت تھی۔ یاکوف کی کفر پرور تقریروں اور انقلابی کتابوں کو وہ گھنٹوں غور سے سُنا کرتا۔ کبھی کبھی وہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتا اور بار بار کہے چلا جاتا کہ "انسان کا دماغ بھی کس قدر عجیب ہے۔"

آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے وہ پڑھنے سے معذور ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بڑا سیانا تھا اور اکثر اپنی وسیع معلومات سے مجھے حیرت میں ڈال دیتا تھا۔

"جرمنی کا ایک بڑھئی ایسا دانا و فرزانہ ہے کہ بادشاہ اس سے مشورہ کیا کرتا ہے۔"

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا اشارہ 'بیبل'[1] کی طرف ہے۔

"تم سے یہ کس نے کہا؟"

سر کھجاتے ہوئے وہ بولا: "بس مَیں جانتا ہوں۔"

یاکوف کو زندگی کے تکلیف دہ ہنگاموں سے کوئی غرض نہ تھی۔ اس کا سارا وقت خدا کے وجود سے انکار کرتے، پادریوں کی تضحیک کرتے اور راہبوں کا مذاق اُڑاتے گزرتا تھا۔

امن پسند نکتیا نے ایک دن پوچھا: "بھائی، تمھیں خدا کے ہونے نہ ہونے سے اتنی دِلچسپی کیوں ہے؟"

یہ سُنتے ہی وہ گرج پڑا: "کیوں، اس میں بُرائی کیا ہے۔ بیس سال تک خدا پر میرا ایمان تھا اور مَیں اس کے نام کو پوجتا تھا۔ لیکن جب مَیں نے غور سے

---

[1] ۱۹ویں صدی کے اواخر میں جرمنی کی اشتراکی تحریک کا ایک قائد۔

انجیل کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سب فریب تھا۔"

اپنے بازوؤں سے 'مکڑی کے جالے' کے تار و پود بکھیرتے ہوئے روہانسی آواز میں وہ بولا: "یہی صدمہ ہے جو قبل از وقت میری جان لے رہا ہے۔"

میرے اور بھی کئی اچھے ملاقاتی تھے۔ کبھی کبھار میں پرانے تنور خانے کا رُخ کرتا تو وہاں میری بڑی آؤ بھگت ہوتی اور سب لوگ کان لگاکر میری باتیں سُنتے تھے۔ مکتیا اور یاکوف سے روز ملنا ناممکن تھا کیوں کہ میری دُکان سے وہ بہت دُور رہتے تھے۔ وہ بھی مجھ سے ملنے نہ آسکتے تھے کیوں کہ ایک تو دُکان میں شریفوں کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ دوسرے نیا نان بائی ایک پنشن خوار سپاہی تھا۔ پولیس سے اس کا یارانہ تھا اور دُکان کے پچھواڑے پولیس کی چوکی تھی۔ جب دیکھیے دیوار پر کوئی نیلی پوش روٹی کی طلب میں بیٹھا ہوا ہے۔ پھر یہ بھی بات تھی کہ مجھے سکون سے وقت بسر کرنے کی تلقین کی گئی تھی تاکہ تنور خانے پر اغیار کو شبہ نہ ہو۔

میری ساری محنت کا کچھ حاصل نہ تھا۔ خرچ کا کوئی حساب نہ رکھا جاتا تھا۔ صندوقچے سے ہر گھڑی پیسے نکال لیے جاتے تھے حتّیٰ کہ کبھی کبھی آٹے کے لیے بھی دام نہ رہتے تھے۔

بےچارا دیری نکوف افسوس سے کہتا: "ہمارا دیوالہ نکل جائے گا۔"

اس کی حالت بھی غیر ہوچلی تھی۔ لال بالوں والی نستیا کھسیانی بلّی کی طرح ہر کھمبے کو نوچنے پر تُلی رہتی تھی۔ وہ دیری نکوف کے سر پر یوں دندناتی چلی آتی گویا اسے دیکھا ہی نہیں۔ اور وہ بےچارا ایک مجرمانہ تبسّم لب پر لاکر ایک طرف ہٹ جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دُکان اور مکان کی بدانتظامی کا شکوہ مجھ سے

کیا کرتا: "سرپیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے دوسرے لے جاتے ہیں۔ ابھی کل ہی چھ جوڑے پاتابے خریدے اور آج غائب ہوگئے۔"

پاتابوں کا ذکر سُن کر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ لیکن جب یہ خیال آیا کہ یہ بھلا مانس تو دوسروں کی خاطر سب کچھ قربان کرتا ہے لیکن اس کے ساتھی اسے برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں تو ہنسی ضبط کرتے ہی بنی۔ یہ سچ ہے کہ دیری نکوف جن لوگوں کی خاطر یہ پاپڑ بیل رہا تھا ان کی تحسین نہ چاہتا تھا۔ لیکن ان سے وہ کم از کم شرافت کی توقع تو ضرور کر سکتا تھا۔ اُدھر اُس کا خاندان تباہی کے منھ میں جا رہا تھا۔ اس کے باپ پر مذہب بھوت کی طرح سوار ہوگیا۔ چھوٹا بھائی شراب نوشی اور عشق بازی میں مگن تھا۔ بہن اپنی محبت میں ناکام ہوکر کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ محبت کے خاتمے کا ثبوت مجھے اس کی آنکھوں سے مِلتا تھا جو رونے سے سُوجی ہوتی تھیں۔

مجھے محسوس ہوتا کہ مَیں اس پر مرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی دُکان کی ملازمہ نزدا پر بھی فِدا ہوں جس کے گلاب سے ہونٹ ہمیشہ مسکرایا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مَیں ساری جنسِ لطیف کا عاشقِ زار بن بیٹھا۔ مجھ پر شہوت کا غلبہ دیر سے ہُوا لیکن زوروں پر ہوا۔ عمر، افتادِ طبع اور ماحول کا تقاضا تھا کہ عورتوں سے پینگ بڑھائیے۔ ہم بستری کا شرف حاصل نہ ہو سکے تو دوستی ہی سہی۔ مَیں اپنے متعلق کھُل کر کسی سے بات کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے پریشان خیالات اور اُلجھے ہوئے تاثرات میں کسی قسم کا ربط پیدا کرسکوں۔

صحیح معنوں میں میرا کوئی دوست نہ تھا۔ کیوں کہ جو لوگ مجھے اناڑی اور انیلا سمجھتے تھے نہ مجھے ان سے ہم دردی تھی اور نہ دِل چسپی۔ اگر مَیں کوئی ایسی بات کہتا جو ان کی سمجھ کے مطابق نہ ہو تو جواب مِلتا "میاں چھوڑو بھی اِس

بکواس کو۔"

گوری پلیٹ نف گرفتار ہوکر قید خانے پہنچ گیا تھا۔ پولیس کے اسی گُرگے نے صبح سویرے راستہ روک کر مجھے یہ منحوس خبر سنائی تھی۔ وہ تمغوں سے لدا پھندا کسی خیال میں مستغرق یوں اکڑتا جارہا تھا گویا ابھی پریڈ سے واپس لوٹ رہا ہو۔ مجھے دیکھ کر بے کچھ کہے سر ہلاتا ہوا وہ آگے گزر گیا۔ لیکن، پھر رُک کر اس نے میری پیٹھ کو جھلائی ہوئی آواز میں یوں مخاطب کیا:

"کل رات پلیٹ نف گرفتار کرلیا گیا۔"

ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بُلاکر اس نے آہستہ سے کہا: "اب اس بدنصیب کی خیر نہیں۔" یہ کہتے کہتے اس کی مکّار آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

گوری کو پہلے سے اپنی گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ اور اس نے تاکید کردی تھی کہ میرے ساتھ باہر نہ نکلا کرو۔

پولیس مین نے نگاہیں جھکاکر پوچھا: "تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آتے؟"

جب مَیں شام کو اس کے گھر پہنچا تو وہ نیند سے جاگ کر انگڑائی لے رہا تھا اور اس کی بیوی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر موزوں کی مرمّت کررہی تھی۔

پولیس مین نے اپنے سینے کو جس میں بالوں کا جنگل اُگا ہوا تھا، کھُجاتے ہوئے مجھے کن انکھیوں سے دیکھا اور کہا:

"اصل بات یہ ہو کہ اس کے گھر سے ایک پتیلی نکلی جس میں وہ زار کے خلاف پرچہ چھاپنے کے لیے روشنائی تیّار کرتا تھا۔"

زمین پر تھوک کر وہ بیوی پر ڈپٹ پڑا: "لا میری پتلون۔"

اس بے چاری نے زمین میں سر گاڑے ہوئے جواب دیا: "ابھی ایک منٹ میں۔"

بوڑھا بولا: " اس کے غم میں یہ رو رہی ہے۔ رنج تو مجھے بھی ہے لیکن ایک طالب علم زار کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

کپڑے پہن کر کہنے لگا: "پل بھر میں آتا ہوں۔ اری او چائے کا پانی گرم کر رکھنا۔"

بیوی نے ہاں کہا نہ نا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی کو گھورتی رہی۔ لیکن اس کے جاتے ہی اُدھر گھونسا دکھلا کر بولی: "مُردار کہیں کا۔"

روتے روتے اس کا چہرا سوج گیا تھا۔ سماوار جلاتے وقت وہ غصّے سے غرّانے لگی:" ایسا چرکا لگاؤں گی کہ مُوا بلبلا اُٹھے گا۔ اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کرنا۔ اب وہ تمھیں پھنسانے کی فکر میں ہے۔ اس کے دِل میں کسی کی مروّت محبّت نہیں۔ اسے تو انسانوں کے شکار میں مزا ملتا ہے۔ اسے تمھارے سب کیے دھرے کی خبر ہے۔"

اتنے میں وہ میرے پاس آئی اور بھکارن کی طرح منمنانے لگی: مجھے گلے نہ لگاؤ گے پیارے؟"

اس عورت سے مجھے چِڑ تھی۔ لیکن اس پر رقّت کا ایسا عالم طاری تھا کہ گلے لگاتے ہی بنی۔ اور مَیں موبخ کی جٹاؤں جیسے اس کے میلے بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ مَیں نے پوچھا: "آج کل وہ کن لوگوں کی ٹوہ میں ہے۔"

"وہ جو رِبنسکیا روڈ کے کسی مکان میں رہتے ہیں۔"

"نام جانتی ہو؟"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی: "آنے دو اس کل منہے کو تمھاری پوچھ گچھ کا حال سُنا دوں گی . . . . . . لو وہ تو آگیا۔" یہ کہہ کر وہ سماوار کی

طرف بھاگ گئی۔

اسی وقت نک فورچ شراب کی بوتل اور روٹی مکھن لیے اندر نازل ہوا۔ چائے پیتے وقت اس کی بیوی میرے پاس بیٹھ گئی اور میری خاطر مدارات کرنے لگی۔ پولیس مین یک بہ یک بول اٹھا: "مکڑی کا وہ جالا ہمارے رگ و ریشے کو بھی جکڑے ہوئے ہے۔ نہ تم اسے توڑ سکتے ہو نہ اس سے چھٹکارا پا سکتے ہو عوام کے لیے زار کا رُتبہ خدا سے کم نہیں۔"

پھر پہلو بدل کر پوچھنے لگا: "تم تو پڑھے لکھے ہو۔ انجیل کا مطالعہ کیا ہی ہوگا۔ کیا تمھاری رائے میں اُس کا ہر ہر حرف حقیقت پر مبنی ہے۔"

"یہ میں کیسے کہ سکتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس میں بہت سی واہی تباہی باتیں شامل کردی گئی ہیں۔ کہا ہے کہ محتاجوں پر خدا کی رحمت ہو۔ ان پر رحمت کس وجہ سے ہو؟ جہاں کہیں غریبوں اور محتاجوں کا ذِکر آیا اسی قسم کی لغو بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ محتاج اور بدنصیب میں بڑا فرق ہے۔"

"کیوں؟"

ذرا دیر گھور کر اس نے ایسی سنجیدگی سے جو غور و فکر کی شاہد تھی، کہا: "انجیل میں رحم و کرم کا ذِکر کثرت سے ملے گا اور یہ قطعاً بے معنی ہے۔ رحم و کرم کا مطلب ہے بے کار بیمار اور کم زور لوگوں پر اپنی توجہ اور وقت ضائع کرنا۔ رحم و کرم کے نام پر قید خانے، محتاج خانے اور پاگل خانے بنائے جاتے ہیں۔ مدد تو ذہین اور مضبوط لوگوں کی کرنی چاہیے تاکہ وہ اپنی ذہانت اور طاقت سے دُنیا کو فائدہ پہنچا سکیں۔ لیکن اس کی بجائے ہم کم زوروں کی مدد کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی تن درست نہیں ہو سکتے۔ اپاہجوں کی دیکھ بھال

ہیں بھلے چنگے بھی کم زور بن جاتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہی کہ یہ زمانہ عیسیٰ کے زمانے سے بالکل مختلف ہی۔ اب سمجھیے کہ تمھارا دوست گوری کیوں اسیرِ زنداں ہوا؟ اس لیے کہ اس کا سینہ رحم و کرم سے معمور تھا۔ بھکاریوں اور محتاجوں کو سدھار کر کیا ہم دُنیا کو سُدھار لیں گے؟"

یہ خیالات عام تھے اور ان سے مَیں پہلے بھی دوچار ہُوا تھا۔ لیکن ایسے اُجاگر رُوپ میں انھیں پہلے کبھی نہ سُنا تھا۔ سچ تو یہ ہی کہ کسی کتاب میں مَیں نے کوئی ایسا نظریہ نہ دیکھا جو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی انسان کی زبانی سُن نہ چکا ہوں۔

لیکن وہ بوڑھا آدم خور برابر انھی خیالات کا پرچار کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر درشتی کے آثار جھلک رہے تھے جنھیں وہ چمکتے ہوئے سماوار کے آئینے میں خود دیکھ سکتا تھا۔ بیوی نے دو مرتبہ اسے یاد دلایا کہ کام پر جانے کا وقت ہو گیا۔ لیکن سُنی اَن سُنی کر کے وہ دماغ کی چرخی سے خیالات کے رنگا رنگ تار نکالتا رہا۔ باتوں باتوں میں خدا جانے کب پینترا بدل کر وہ اس مقام پر آ دھمکا کہ: "تم تو ماشاءاللہ ذہین اور ہونہار ہو۔ نان بائی کا پیشہ تمھیں کب زیب دیتا ہی۔ خدمتِ خلق اور روزی کمانے کے اور طریقے بھی تو ہیں۔"

لیکن دورانِ گفتگو میں مَیں اس اُدھیڑبُن میں مبتلا تھا کہ یہ جن کے شکار کی فکر میں ہی انھیں کس طرح خبردار کروں۔ کیوں کہ مَیں ان سے ناواقف تھا۔ ان میں سے ایک شخص کا نام سوموف بتایا جاتا تھا جو سائبیریا میں قید و بند کے مصائب برداشت کر کے لوٹا تھا۔ اور اس کے متعلق عجیب و غریب روایات مشہور تھیں۔

جانے کیوں وہ نامعقول کہنے لگا: "عقل مندوں کو یوں رِل مِل کر رہنا چاہیے جیسے چھتے میں شہد کی مکھیاں"

بیوی نے بات کاٹ کر کہا: "نو بج گئے"

"لاحول ولا قوۃ"

وردی کے بٹن لگاتے ہوئے وہ بولا: "کوئی بات نہیں۔ تانگے پر چلا جاؤں گا۔ خدا حافظ۔ میاں، کبھی کبھار آجایا کرو۔ اپنا ہی گھر سمجھو"

مَیں وہاں سے تہیہ کرکے نکلا کہ اب کبھی نہ آؤں گا۔ بوڑھا تھا تو دلچسپ لیکن مجھے اسے دیکھ کر گھِن آتی تھی۔ رحم و کرم کے خلاف اس نے جو کچھ کہا اس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ بلاشبہ اس میں حقیقت کا تھوڑا سا شائبہ بھی تھا لیکن یہ خیال کسی پولیس والے کے دماغ میں ہی آسکتا تھا۔

اس موضوع کا اکثر چرچا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل واقعے نے میرے دِل میں اس وقت خاصا ہیجان برپا کردیا تھا۔

ہماری بستی میں طالس طائی کے ایک چیلے کا گزر ہوا۔ اس لم تڑنگ کے چہرے پر بکری کی سی ڈاڑھی لہرا رہی تھی اور اس کے ہونٹ حبشیوں کے سے تھے۔ وہ ہمیشہ سر جُھکائے زمین کو تاکا کرتا تھا لیکن کبھی کبھی اپنا گنجا سر ہلاکر دہکتی ہوئی آنکھوں سے کسی کو یوں گھورتا تھا کہ اس کی رُوح تک جل جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی لَو سلگتی رہتی تھی۔ کسی پروفیسر کے مکان میں وہ محفلِ مناظرہ منعقد کرتا۔ جو نوجوان اس میں شرکت کرتے ان میں ایک خوب رُو پادری تھا۔ وہ ریشم کا سیاہ لبادہ زیبِ تن کیے ہوئے تھا جس سے زرد چہرے کا حُسن زیادہ کِھل گیا تھا۔ اور خاموش بھوری آنکھوں کی اُداس مسکراہٹ بھی اُجاگر ہوجاتی تھی۔

طالس طائی کا چیلا دیر تک انجیل کی ابدی حقیقتوں پر وعظ فرماتا رہا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سے جملوں اور دبی ہوئی آواز میں درشتی کا پہلو تو تھا لیکن ان میں ایمانِ راسخ کی چنگاری بھی سلگ رہی تھی۔ اپنے بائیں ہاتھ کی جنبش سے وہ تقریر میں زور پیدا کرتا اور داہنے کو برابر جیب میں چھپائے رکھتا۔

کونے میں سے کسی نے زیرِ لب کہا "ایکٹر ہے —"

"ناٹک کا سوانگ تو ہے مگر —"

مجھے محسوس ہوا کہ یہ ان لوگوں میں ہے جو حُبِ انسانیت کے نام پر انسانوں کو قتل کرنے یا زندہ جلانے سے مطلق دریغ نہیں کرتے۔

اس کی سفید قمیص کی آستینیں چوڑی تھیں اور ان پر ایک بھورا چوغا تھا۔ یہ لباس بھی سب سے نرالا تھا۔ وعظ ختم کر کے وہ پکار اٹھا:۔

"تم عیسیٰ کے حامی ہو یا ڈاروِن کے؟"

یہ سوال پتھر کی طرح کونے میں جا کر پڑا جہاں جوان زن و مرد حیرت و جوش کے عالم میں اس کی باتیں سُن رہے تھے۔

بہ ظاہر ہر سُننے والا اس کی تقریر سے متاثر ہوا تھا۔ جسے دیکھیے سر جھکائے سوچ بچار میں محو تھا۔ اُس کی آتشیں نگاہوں کے مقابلے کی تاب بھلا کون لا سکتا تھا۔ پھر اس نے گرج کر کہا:

"اِن دونوں کے اصولوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور منافقوں کے علاوہ کوئی ان میں ارتباط کا دعوا نہیں کرتا۔ ایسا کرنے والا جھوٹا اور انسانیت کا دُشمن ہے۔"

اب کیا تھا۔ ہر طرف سے لفّاظی کا طوفان امنڈ پڑا اور سنجیدگی کی دھجیاں بکھر گئیں۔

طالس طائی کے چیلے کی آنکھیں حقارت و نفرت سے چمک پڑیں۔ اور وہ غرّایا: "محبت ہی حقیقتِ مطلق ہے۔"

لفظ آرائی نے مجھے اِس حد تک مسحور کیا کہ معنی و مطالب میرے ذہن سے خبط ہوگئے۔ الفاظ کا وہ دونگڑا برسا کہ زمین تھرّانے لگی۔ اور اس بھونچال سے میں ایسا سراسیمہ ہوُا کہ دِل ہی دِل میں کہنے لگا۔ دُنیا میں تجھ سے بڑا کوئی احمق نہیں۔

یک بہ یک طالس طائی کا چیلا ماتھے کا پسینہ جھٹک کر زور سے چلآیا: "انجیل کی تقدیس سے انکار کردو لیکن اس کے نام پر جھوٹ نہ بولو۔ عیسیٰ کو دوبارہ سولی پر ٹانگ دو لیکن اس کے نام کی قسم نہ کھاؤ۔"

یہ سوال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوند پڑا کہ اگر کش مکش حیات کا مقصد ابدی مسرّت کی تلاش ہی تو مہر و محبّت سے اسے کوئی مدد نہیں مِل سکتی۔

پوُچھنے پر معلوم ہوا کہ اِس واعظ کا نام "کلوپسکی" تھا۔ دُوسرے دن میں اس کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اس وقت وہ دو امیرزادیوں کا مہمان تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ باغ میں نیموں کے پیڑ تلے ان دونوں کو لیے بیٹھا ہی۔ وہ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے جن میں سے سینے کے بال جھلک رہے تھے۔ اس کے دراز قد اور نزار بدن کو دیکھ کر مجھے اُن رمتے جوگیوں کا خیال آیا جو خدمتِ خلق کے دردِ سر میں مبتلا رہتے ہیں۔

اس وقت وہ چاندی کے چمچے سے بالائی اور شہد نوش جاں کر رہا تھا اور یقیناً اسے یہ نعمت ازحد پسند تھی کیوں کہ ہر نوالے کے بعد وہ لبوں کو زبان سے چاٹتا اور مونچھ کے بالوں سے بالائی کے ریزوں کو صاف کرتا۔

ایک لڑکی میز کے پاس اس کے حکم کی منتظر کھڑی تھی۔ دُوسری پیڑ کا

سہارا لیے خواب دیدہ نظروں سے نیلے آکاش کو تاک رہی تھی۔ دونوں گلابی جوڑوں میں ملبوس تھیں۔ اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون گنگا ہی اور کون جمنا۔ واعظ مجھ سے مہربانی سے پیش آیا، اور دیر تک محبت کی تخلیقی قوت پر گفتگو کرتا رہا۔ نیز یہ سمجھاتا رہا کہ ہر انسان کو اپنے اس روحانی جوہر کو جِلا دینی چاہیے جو اسے کائنات سے ہم آہنگ کرتا ہی:

"جو محبت سے ناآشنا ہی وہ زندگی سے ناواقف ہی۔ جو کہتے ہیں کہ رازِ حیات کش مکش میں مضمر ہی ان کی روح مُردہ ہو چکی ہی اور وہ تباہی کے راستے پر چل رہے ہیں۔ آگ کو آگ نہیں بجھا سکتی۔ اسی طرح بُرائی کا سدِباب بُرائی سے نہیں ہو سکتا۔"

لیکن جب لڑکیاں اٹکھیلیاں کرتی باغ سے چلی گئیں تو واعظ نے ناک بھنوں چڑھا کر پوچھا:۔

"تم کون ہو جی؟"

میری رام کہانی سنتے وقت وہ انگلی سے میز پر تال دیتا رہا۔ پھر یہ بحث شروع کی کہ انسان کی جد و جہد کا مقصد دنیوی منفعت نہیں بلکہ روحانی تسکین ہونا چاہیے۔

"آدمی جتنا غریب ہو حقیقت سے اسی قدر قریب ہوتا ہی۔"

مجھے شبہ ہوا کہ وہ 'حقیقت' کے مفہوم سے خود ناآشنا ہی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ میری قربت اُسے ناپسند ہی زیادہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجھے حقارت سے گھور کر اس نے جمہائی لی اور ٹانگیں پسار کر آنکھیں بند کرلیں۔ اور گویا خواب میں بڑبڑایا:

"قانونِ حیات یہ ہی کہ محبت کے راستے میں قربان ہو جاؤ۔"

اچانک اس کے جسم میں رعشہ سا آیا اور اس نے ہوا میں ہاتھ یوں پھیلایا گویا کسی اُڑتی ہوئی شے کو پکڑنا چاہتا ہے۔ پھر گھبرا کر بولا:

"کیا بات ہے؟ — بھئی معاف کرنا، مَیں تھک گیا ہوں" اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئیں۔ اس کے دانت یوں کھُلے کے کھُلے رہ گئے گویا وہ کرب میں ہو۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹک گیا اور اُوپر کا ہونٹ اُبھر گیا جس کی وجہ سے مونچھ کے بال تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

مجھے اس کے خلوص پر اعتبار نہ ہوا اور واپسی کے وقت میرے دِل میں مخالفت کا غبار بھرا ہوا تھا۔

چند روز بعد مَیں صبح سویرے ایک دوست کے گھر روٹیاں پہنچانے گیا۔ وہ یونی ورسٹی کا اُستاد تھا۔ شادی نہیں ہوئی تھی اور شراب کا عادی تھا۔ اس کے کمرے میں مَیں نے دُوسری مرتبہ کلوپسکی کو دیکھا رات کو وہ سویا نہ تھا کیوں کہ چہرہ مرجھایا ہوا اور آنکھیں لال تھیں۔ غالباً وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھا۔ پروفیسر نے اتنی پی لی تھی کہ خواہ مخواہ روئے چلا جاتا تھا۔ وہ فرش پر لنگوٹ بند بیٹھا گِتار بجا رہا تھا۔ اور اس کے آس پاس خالی بوتلوں، اُلٹی کرسیوں اور کپڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ دائیں بائیں جھولتے ہوئے وہ بڑبڑاتا جاتا تھا:

"رحم ——— کرم"

لیکن کلوپسکی غصّے سے چلّانے لگا:

"رحم و کرم کی کوئی ضرورت نہیں۔ محبّت کی خاطر ہم سب فنا ہو جائیں گے۔ ہماری قسمت میں بربادی لکھی ہوئی ہے"

مجھے پروفیسر کے سامنے دھکیل کر وہ بولا: "اس سے پوچھو کہ کیا

اسے کسی کی محبت کی ضرورت ہے۔"

پروفیسر اشک آلود متوالی نگاہوں سے مجھے گھور کر ہنس پڑا: "یہ نان بائی ہے، میری طرف اس کے دام نکلتے ہیں۔"

جیب سے چابی نکال کر کہا: "تحویل میں جو کچھ ہے تمھارا۔"

لیکن طالس طائی کے چیلے نے چابی چھین کر مجھے اشارہ کیا:

"اس وقت چلتے بنو۔ دام بعد میں مل جائیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹ

روٹیوں کو کوچ کے اوپر اُچھال دیا۔

حیرت ہوئی کہ مجھے اس نے پہچانا نہیں۔

جاتے وقت اس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے

محبت غارت گر ہوتی ہے۔ اور اس کے خلاف میرے دل میں نفرت کا جذ

اُبھر اُٹھا۔

مجھے اطلاع ملی کہ اسی دن واعظ نے یکے بعد دیگرے اپنی دونوں میزب

کے آگے ہدیۂ عشق پیش کیا۔ دونوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی لیکن جب دونو

سر جوڑ کر بیٹھیں تو واعظ کا بھرم کھل گیا اور اپنے عاشق پر ان کا غصہ پھٹ

اسی وقت دربان کو حکم ہوا کہ اس پریم پجاری کو بہ یک بینی و دو گوش گھر

نکال دو۔ اس کے بعد وہ شہر سے منھ کالا کر گیا۔

انسانیت کس حد تک ہماری ہم دردی اور رواداری کی مستحق ہے یہ اہ

سوال بہت پہلے سے مجھے بے چین کر رہا تھا۔ شروع میں تو اس نے میر

روح میں گتھی سی ڈال دی۔ بعد ازاں ایک آیتِ ربانی کی طرح یہ جملہ دما

کے سونے آسمان میں کڑک اُٹھا: "زندگی کو کس حد تک محبت کی ضرورت

جو کتاب اٹھایئے اس میں انسانیت کا نوحہ ہوتا اور انسانوں سے

رحم و کرم کی تلقین کی جاتی۔ میں جنھیں اہل رائے سمجھتا وہ بھی انھی خیالات کی ترغیب کرتے۔

لیکن میں سماج کا جتنا مشاہدہ کرتا اسی قدر یہ تلخ حقیقت واضح ہوتی جاتی کہ اس میں انسانی ہم دردی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ زندگی کی ورق گردانی کرتا تو اس کے ہر ہر صفحے پر ظلم و نفرت کی خونیں داستان نظر آتی۔ بے معنی چیزوں کی ملکیت کے لیے مسلسل کش مکش کا نام زندگی تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا کتابوں کے علاوہ اور سب چیزیں میرے لیے بے کار اور غیر ضروری تھیں۔

جب کبھی فرصت کا کوئی لمحہ میسر ہوتا میں پھاٹک پر جا بیٹھتا۔ اس وقت محسوس ہوتا کہ ان مزدوروں، بنیوں اور منشیوں سے میری زندگی قطعاً مختلف ہے۔ جن لوگوں کی میں دل و جان سے عزت کرتا تھا وہ بھی میری ہی طرح زندگی کے اس میلے میں تنہا تھے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا اور ان کیڑے مکوڑوں کی دوڑ دھوپ سے انھیں کوئی غرض نہ تھی۔ ان دوپایوں کی تگ و دو مجھے بالکل بے رنگ اور بے حقیقت معلوم ہوتی تھی۔ اکثر دیکھنے میں آتا کہ لوگ زبان سے تو انسانیت اور دین داری کے بڑے بڑے دعوے کرتے، لیکن بہ وقتِ عمل اپنے ذلیل رویے میں کوئی تبدیلی نہ کر سکتے تھے۔ اس گورکھ دھندے کا بھید پانا میرے بس کا روگ نہ تھا۔

ایک مرتبہ مویشیوں کے جراح لاف روف نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

"اگر ظلم اس انتہا کو پہنچ جائے کہ سب اس سے تنگ آ جائیں اسی طرح جیسے ہم پت جھڑ کے موسم سے بیزار ہو جاتے ہیں تو شاید اس مرض کا

علاج ہو سکے۔"

پت جھڑ نے سردی، بارش اور تاریکی کی چادر پھیلادی تھی۔ اس کے ساتھ جو وبائیں پھیلیں ان میں خودکشی کی وبا بھی تھی۔ چناں چہ لاف روف نے جو جلندر کا پُرانا مریض تھا، زہر کھاکر اپنی جان دے دی۔

اس کے مالکِ مکان نے جو درزی تھا اسے دفنایا۔ اور فاتحہ کے بعد بولا: "وہ بیلوں کا معالج تھا لیکن اس کی موت بیلوں کی سی ہوئی۔" یہ درزی جس کا نام مدنی کوف تھا بڑا عبادت گزار اور پرہیزگار تھا۔ مریم کے سب بھجن اسے زبانی یاد تھے۔ اپنے معصوم بچوں کو وہ چمڑے کے تسمے سے اور بیوی کو بید سے بے تکان پیٹا کرتا تھا۔ اس ضمن میں اسے شکایت تھی کہ منصف نے مجھے یہ کہہ کر سزا دی کہ مارپیٹ کا یہ طریقہ مَیں نے چینیوں سے سیکھا ہے۔ لیکن مَیں نے تو کسی زندہ چینی کو دیکھا بھی نہیں۔ البتہ تصویروں میں ان کی شکل دیکھی ہے۔

اس کے ایک شاگرد نے ان الفاظ میں اپنے مالک کا ذکر کیا "نرم دل عبادت گزاروں کو دیکھ کر میری جان نکلتی ہے۔ ظالم یا مجرم تو صاف پہچانا جاتا ہے اور اس کے دار سے ہر آنکھوں والا بچ سکتا ہے۔ لیکن دین دار پر کیسے شبہہ ہو سکتا ہے۔ سانپ کی طرح اس کا حملہ اچانک ہوتا ہے اور بچنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ نرم دل انسانوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

مدنی کوف کے اس تیز طرّار شاگرد نے خدا لگتی بات کہہ دی۔ پہلے میرا عقیدہ تھا کہ جس طرح کیچوے بنجر زمین کو نرم کر دیتے ہیں اسی طرح زندگی کی سنگین سطح کو رحم دل انسان ملائم بنادیتے ہیں۔ لیکن جب انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کہ وہ حالات کے ساتھ کس طرح بدل جاتے ہیں اور ہر ذلت سے

'مصلحت' کے نام پر سمجھوتا کرلیتے ہیں تو مجھے ویسی ہی تکلیف ہوئی جیسی کسی زخمی گھوڑے کو مکھیوں کے غول میں پھنس کر ہوتی ہے۔

پولیس مین کے گھر سے واپسی کے وقت اسی قسم کے خیالات میرے دماغ میں چکّر لگا رہے تھے۔

ہَوا کراہ رہی تھی، چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ اور گمان ہوتا تھا کہ زمین پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے آسمان لرز رہا تھا۔ ایک طوائف جو پانی میں شرابور تھی کسی متوالے کا ہاتھ تھامے خراماں چلی جارہی تھی۔ وہ کبھی بڑبڑاتا اور کبھی سسکیاں بھرتا جاتا تھا۔ عورت نے تھکی ہوئی کھسیانی آواز میں کہا:

"تمھاری قسمت پر —"

مَیں بھی سوچ میں پڑ گیا: "سچّی بات ہے۔ اسی طرح کوئی میرا ہاتھ تھامے زندگی کے نشیب و فراز سے انسانوں کے ازدحام میں سے لیے جا رہا ہے اور اس سفر میں کتنے عبرت ناک اور روح فرسا مناظر کا تماشا ہوتا ہے۔ اس متوالے کی طرح مَیں بھی تھک گیا ہوں۔"

یہ خیال بجلی کی مانند میرے دِل میں کوند گیا۔ اور اس شام کو پہلی بار مجھے روحانی درماندگی کا احساس ہوا۔ اب مجھے اپنے انحطاط کا خیال ستانے لگا۔ آپ اپنا تجزیہ مَیں ایسی غیر جانب داری سے کرنے لگا گویا میرا نفس کوئی ذاتِ دِگر ہے اور وہ میری حریف و مخالف ہے۔

مَیں نے دیکھا کہ ہر فرد کے قول و فعل میں ہی نہیں جذبات میں بھی تضاد ہے۔ اور جو ہیجان اس تضاد کو پرچاتا تھا وہ خاص طور پر میری اذیت کا باعث تھا۔

مَیں نے اپنے آپ کو اسی تضاد کا شکار پایا۔ کبھی مَیں عورتوں کی طرف بھاگتا تو کبھی کتابوں کی جانب۔ کبھی مزدوروں کی طرف تو کبھی کھلنڈرے طلبہ

کی سمت۔ لیکن مَیں کہیں نہ پہنچ پاتا تھا۔ نہ مَیں کوّا رہا اور نہ ہنس بن سکا۔ مَیں تکلی کی طرح چکّر کھائے چلا جاتا تھا۔ لیکن نہ معلوم ہُوا کہ کس کا کرشمہ مجھے گردش میں رکھتا ہی۔

سُننے میں آیا کہ یاکوف ہسپتال میں پڑا ہی۔ مَیں اسے دیکھنے گیا لیکن ایک عینک باز موٹی تازی عورت نے راستہ روک کر روکھے پن سے کہا: "وہ تو مرگیا"

جب مَیں وہاں سے نہ ہلا اور چُپ چاپ اس کے سامنے کھڑا رہا تو وہ آگ بگولا ہوگئی اور چلائی:

"اب کیا ہی؟ کھڑا کیا دیکھتا ہی؟"

مَیں بھی آپے سے باہر ہوگیا اور چیخ پڑا:

"بے وقوف کہیں کی"

وہ گلا پھاڑ کر پکار اُٹھی: "کوئی ہی۔ اس مردود کو کان پکڑ کر باہر نکال دو"

ملازم پیتل کے ڈنڈوں کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ اس نے گٹکری بھر کر میری پیٹھ پر پیتل کے ڈنڈے کا ایک بھرپوُر وار کر دیا۔ مَیں نے اسے بازوؤں میں دبوچا اور اسپتال کے عین سامنے پانی کی نالی میں پھینک دیا۔ اس پر ہیبت کا وہ عالم طاری ہوا کہ کچھ دیر مجھے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر بس اتنا کہا:

"تُف ہی تجھ پر جنگلی کتّے!"

مَیں ایک باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور بے اختیار جی چاہا کہ کوئی ایسی حرکت کروں کہ راہ چلتے غصّے سے چیخ اٹھیں اور جب وہ مجھ پر حملہ کریں تو ان کی ایسی خبر لوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ لیکن یہ ارادہ دل ہی دل میں رہ گیا۔

چھٹی کا دن تھا مگر باغ میں ایک چڑیا کا بچّہ بھی نظر نہ آیا۔ صرف ہوا کی آہ و زاری سُنائی دیتی تھی۔ شفق کی پُراسرار سُرخی باغ پر جادو سا پھونک رہی تھی۔ مَیں سوچنے لگا کہ یاکوف نے اپنی ساری رُوحانی قوّت خدا کے انکار میں صرف کر دی لیکن اپنے آپ کو اس موت سے نہ بچا سکا جو سب سے ایک سا برتاؤ کرتی ہے۔ یہ کتنا افسوس ناک لیکن سبق آموز امر تھا۔

مَیں نکتیا سے ملنے گیا۔ وہ اپنے حجرے میں چراغ روشن کیے پھٹے ہوئے کوٹ میں تھگلی لگا رہا تھا۔

"یاکوف مر گیا"

بوڑھے نے سوئی الگ رکھ کر ہاتھ یوں اُٹھایا گویا صلیب کا نشان بنانا چاہتا ہے۔ لیکن بلا ارادہ اس کے ہاتھ نے بے معنی سی جنبش کی۔ سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے اُس نے زیرِ لب نہ جانے کسے اور کیوں ایک گندی گالی دی۔ پھر وہ بکنے لگا "ہم سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ زندگی کا یہ انجام کس درجہ احمقانہ ہے۔ ہاں بھائی، وہ مر گیا۔ جس لہار نے اس سے میرا تعارف کرایا، وہ بھی اب اس دُنیا میں نہیں ہے۔ طلبہ سے وہ بھی سانٹھ گانٹھ رکھتا تھا۔ اچھا، تو، میرے کوٹ میں ٹانکے تو لگا دو۔ مجھے تو کچھ نہیں سُجھائی دیتا۔"

سوئی دھاگا میرے سپرد کر کے وہ کھانستا کھنکھارتا ہوا کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا:

"کبھی یہاں وہاں کوئی جگنو چمک جاتا ہے۔ لیکن شیطان اس کا گلا دبا دیتا ہے۔ پھر ہر طرف تاریکی چھا جاتی ہے۔ عجیب غدّار شہر ہے۔ مَیں تو اگن بوٹ پر بیٹھ کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

پھر سر کھجا کر اس نے اپنے آپ سے سوال کیا: "لیکن میاں جاؤ گے کہاں؟"

اور پھر خود ہی جواب دیا: "عمر بھر جہاں گشتی کرکے کیا ملا۔ تلووں میں چھالے اور دل میں داغ کے سوا کیا ملا۔"

زمین پر تھوک کر وہ بولا "کیسی نامعقول زندگی ہے۔ اتنی عمر گزر گئی لیکن روح یا جسم کے لیے میں نے کچھ نہیں کیا۔"

دہلیز کے پاس وہ یوں خاموش کھڑا ہوگیا گویا کسی کی آواز سن رہا ہو۔ پھر میرے پاس آکر میز کے کونے پر بیٹھ گیا:

"میاں یاکوف نے بے سوچے سمجھے خدا کے تجسس میں اپنی عمر ضائع کردی۔ یہ سچ ہے کہ میرے ماننے یا نہ ماننے سے خدا یا زار کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ لیکن آفریں ہے اس پر جس نے اپنی ذات سے بیزار ہوکر جان دے دی۔ قوتِ حیات کے لیے اس قسم کی قربانی ضروری ہے۔ لیکن میں بوڑھا ہوچکا، مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ کسی دن میں اندھا بھی ہوجاؤں گا۔ حیرت کا مقام ہے ——— کوٹ سل گیا؟ — شکریہ۔ آؤ، چائے خانے میں چل کر بیٹھیں۔"

باہر تاریکی میں وہ لڑکھڑایا اور اگر میرا سہارا نہ لیتا تو ضرور گر پڑتا:

"میری بات یاد رکھنا۔ انسان ہمیشہ یہ مصائب برداشت نہ کریں گے۔ کسی نہ کسی روز ان کا غصہ جوالامکھی کی طرح پھٹ پڑے گا اور اس میں سب کچھ جل جائے گا۔ ہر ظلم اور ذلالت کو وہ پانو تلے کچل کر رکھ دیں گے۔"

ہم چائے خانے تک نہ پہنچ سکے۔ کیوں کہ راستے میں ایک چکلہ گھر پڑتا تھا جسے جہازیوں نے گھیر رکھا تھا اور مزدور انھیں اندر جانے سے روک رہے تھے۔

نکتیا نے اطمینان سے کہا: "ہر اتوار کو یہاں ہنگامہ ہوتا ہے۔"

محافظوں میں جیسے ہی اسے کچھ جانی پہچانی صورتیں نظر پڑیں۔ اس نے

عینک جیب میں رکھی ۔ اور نعرۂ حیدری لگا کر دنگے میں شامل ہو گیا ۔ "مزدور د، ہرگز دروازہ نہ کھولنا ۔ جانوروں کو زندہ جلا دو ۔ بھاگنے نہ پائیں "

اس بوڑھے کی چابک دستی اور جوش و خروش کو دیکھ کر بڑا لطف آیا کہ کس بے باکی سے جہازیوں کے دَل میں پل پڑا اور پینترے بدل بدل کر ان کا مقابلہ کرنے لگا۔

طاقت کی فراوانی اور جواں مردی کے مظاہرے کی خاطر وہ لوگ اس ہنگامے پر آمادہ ہوئے تھے اور اس میں بھی ان کی خوش مزاجی صاف جھلک رہی تھی ۔ جہازی ٹڈی دَل کی طرح دروازے میں گھس پڑتے تھے لیکن مزدور پھر انہیں دھکا دے کر باہر نکال دیتے تھے ۔ ہر طرف سے صدا بلند ہو رہی تھی :

"ان کے گنجے لیڈر کا سر توڑ دو !"

چکلے گھر کی چھت پر دو من چلے چڑھ گئے تھے اور بڑے مزے میں کسی گیت کا یہ بند دوہرا رہے تھے ؎

ڈاکو ہیں نا چور ہیں نا ہیں ہم نا ہنجار
دریا سے ہم آئے ہیں نیا کے کھیون ہار

پولیس کا جمع دار سیٹی بجا رہا تھا ۔ لڑتوں کے پاؤں تلے کیچڑ عجیب آواز پیدا کر رہی تھی ۔ اور اوپر یہ گیت لہرا رہا تھا ؎

جال بچھایا ہم نے دیکھو ندی کی چھاتی پر
اس میں آ کر ابھی پھنسے گی ایک جل پری سُندر

"ٹھہر جاؤ ۔ گرے ہوئے پر ہاتھ اُٹھانا کہاں کی دلیری ہے ۔"

"بڑے میاں ڈٹے رہو "

نکتیا اور پانچ آدمیوں کے ساتھ ہمیں پولیس کی حراست میں لے لیا گیا ۔ راستے میں اتنا اندھیرا تھا کہ دوست دشمن کی تمیز ناممکن تھی ۔ ہماری رہ نمائی

ایک گیت کر رہا تھا ؎

سمندر میں غوطہ لگاؤں گا مَیں
موتی چُنوں گا سجیلے۔
موتی کی مالا بناؤں گا مَیں۔۔۔
تیرے لیے پیاری تیرے لیے

نکتیا نے ناک صاف کرتے ہوئے مسرّت آمیز لہجے میں کہا:
"دریائے دولگا کے کنارے رہنے والوں کا سا دِل گُردہ کوئی لا تو دے"
اور میرے کان میں کہا "موقع ملتے ہی تم بھاگ جانا۔ تم حوالات کیوں جاؤ"
ایک دُبلے پتلے جہازی کے ساتھ مَیں کسی تنگ سی گلی میں غائب ہوگیا۔
اس کے بعد نکتیا سے پھر ملاقات نہ ہوئی۔ ویسا ہوش مند اور شفیق دوست مجھے کبھی نہ مِلا۔

اکیلاپن مجھے ستانے لگا طالب علم اب بھی اپنی اُسی دُنیا میں رہتے تھے لیکن ان کی تحریک مجھے بیہودہ معلوم ہونے لگی۔

میرے آس پاس وہی پُرانی چہل پہل جاری تھی۔ لیکن اس میں ایک قسم کا یاسی پن پیدا ہوگیا تھا۔ دِل کہتا کہ تعلیم کی خاطر ہر کوفت برداشت کی جاسکتی ہے۔ اس زمانے میں اگر کوئی کہتا کہ خوب پڑھو لکھو لیکن اس کے عوض روز بول کی قیمچی سے تمھاری مرمّت کی جائے گی، تو مَیں یہ شرط بھی قبول کرلیتا۔

ایک دن جو سمی نوف کے تنور خانے کی طرف جانا ہوا تو کیا سنتا ہوں کہ سب نان بائی یونی ورسٹی میں گھُس کر طلبہ کی پٹائی پر تُلے ہوئے ہیں۔

خبیثانہ لہجے میں انھوں نے اطلاع دی کہ "ہم ترازو کے بٹوں سے ان کا کچومر نکال دیں گے"۔ مَیں ان سے اُلجھ پڑا۔ لیکن یک بہ یک مجھے محسوس

ہوا کہ طلبہ کے لیے میرے دِل میں کوئی ہم دردی نہیں اور ان کی تائید میں میرے پاس کوئی دلیل نہیں۔ خوب یاد ہے کہ مَیں دل پر ایک بارِ غم لیے ہوئے وہاں سے واپس لوٹا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ میری رُوح کو اپنی مہم میں زبردست شکست ہوئی ہے۔ راتوں کو مَیں دریائے کابان کے کنارے دیر تک بیٹھا اس میں کنکریاں پھینکا کرتا۔ اور میرے خیالات ان تین الفاظ میں سمٹ آئے کہ مَیں کیا کروں؟"

دِل بہلانے کے لیے مَیں نے وایولن بجانا شروع کیا۔ رات کو دُکان میں اس کے تاروں کو چھیڑتا اور اس کی بے سُری تانوں سے چوکی دار اور چوہے پریشان ہوجاتے۔ مجھے موسیقی سے اُنس تھا اور اب مَیں نے باقاعدہ سبق لینا شروع کیا۔ لیکن ایک مرتبہ ذرا دیر کے لیے دُکان کے باہر گیا تھا۔ کہ اُستاد نے صندوقچہ کھُلا پاکر ساری جمع پونجی پر ہاتھ صاف کردیا۔ ابھی وہ روپیہ پیسہ جیب میں بھر ہی رہا تھا کہ مَیں آ پہنچا۔ اس نے سر جھکا کر کہا:

"جتنا جی چاہے مجھے مارو۔"

اس کے بے رنگ ہونٹ لرزنے لگے اور بے نور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

مَیں اس پر ہاتھ اُٹھاتے اُٹھاتے رہ گیا۔ غصّہ ضبط کرنے کے لیے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ نیچے دبالیے۔ اس سے ڈانٹ کر کہا کہ رُپے جہاں سے اُٹھائے تھے وہیں رکھ دو۔ جیب خالی کرکے وہ دروازے کی طرف چلا اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا:

"مجھے دس روپوں کی ضرورت ہے۔"

مَیں نے رُپے تو دے دیے لیکن اس دن سے وایولن کا خیال بھی چھوڑ دیا۔

دسمبر کے مہینے میں مَیں نے خودکشی کا تہیّہ کیا۔ بازار سے ایک ریوالور

خرید لایا اور اس میں چار کارتوس بھرے۔ گولی دِل کی بجائے میرے پھیپھڑوں میں جا گھسی۔ اور میری خفت کی انتہا نہ رہی جب چند ہفتے بعد پھر بھلا چنگا ہوکر اسی تنور خانے میں آموجود ہوا۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے میں حالات میں کایا پلٹ ہوئی۔ آغازِ بہار کی کسی شام کا ذکر ہے۔ مَیں دُکان میں داخل ہی ہوا تھا کہ خوکول پر نظر پڑی جو کرسی پر بیٹھا دھنوئیں کے بادل اُڑاتے ہوئے غور سے ان کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سلام دعا کے بغیر اس نے پوچھا "فرصت ہے؟"

"ہاں پندرہ بیس منٹ کوئی کام نہیں۔"

"آؤ بیٹھو، کچھ کام کی بات ہوجائے۔"

حسب دستور وہ چمڑے کے کوٹ میں ملبوس تھا۔ لمبی ڈاڑھی چوڑے سینے کی بلائیں لے رہی تھی اور پانو دیہاتی جوتوں میں بند تھے۔ جن سے کول تار کی بدبُو آرہی تھی۔

نہایت سنجیدہ و متین لہجے میں وہ کہنے لگا: "تم میرے پاس کیوں نہ آجاؤ۔ مَیں وولگا کے کنارے یہاں سے پینتالیس میل دُور ایک گانو میں رہتا ہوں۔ میری ایک دُکان ہے۔ اس میں میرے ساتھ کام کر سکتے ہو۔ زیادہ وقت نہ لگے گا۔ میرا کتب خانہ خاصا اچھا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں مَیں تمھاری مدد کروں گا۔ کیا رائے ہے؟

"مَیں تیار ہوں۔"

گانو کا نام بتاکر اس نے ہدایت کی کہ جمعے کی شام کو گھاٹ پر جاکر فلاں ملّاح کی کشتی پر بیٹھ جانا۔ مَیں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔ اچھا اب جاؤ۔ خدا حافظ۔"

ایک ہاتھ اس نے میری طرف بڑھایا۔ اور دُوسرے ہاتھ سے جیب سے

چاندی کی گھڑی نکالی " لو، ہماری بات چیت چھ منٹ میں ختم ہوگئی ۔ ۔ ۔ اور ہاں، یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ میرا اصلی نام مائیکل روس ہی۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل دیا۔

دو روز بعد ہم کشتی پر بیٹھ کر اس گانو کو روانہ ہو گئے۔ وولگا کی برف حال ہی میں پگھلی تھی۔ اب بھی برف کے بڑے بڑے ڈھیمے پانی میں تیرتے پھر رہے تھے۔ وہ آ آکر بجرے کے دائیں بائیں ٹکراتے اور ٹوٹ کر چکنا چور ہوجاتے تھے۔ ہوا دھارے کے موافق تھی جس کی وجہ سے موجیں پھٹ کر کنارے کی طرف نکل جاتی تھیں۔ سورج کی کرنیں برف پاروں کے نیلے محوروں میں عجیب تابانی پیدا کر رہی تھیں۔ بجرا صندوقوں اور تھیلوں کے بوجھ سے کراہ رہا تھا۔ پتوار ایک جوان کسان کے ہاتھ میں تھی جو بھیڑ کی کھال کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی چال ڈھال میں اتنی متانت تھی کہ کوئی اسے کسان نہ کہتا۔ اس کا ساتھی کگش کن بجرے کے دوسرے سرے کی رکھوالی کر رہا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال پھٹے ہوئے کپڑے اور بوکھلائے ہوے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی غریب کسان ہی۔ لوہے کے چمٹے سے وہ برف کے ڈھیموں کو الگ ہٹا رہا تھا۔

میں بادبان کے نیچے صندوقوں کا ٹیکا لگائے روس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا: "کسان مجھے پسند نہیں کرتے خصوصاً امیر کسان۔ تمھیں بھی ان کی مخالفت کو برداشت کرنا ہوگا۔"

کگش کن چمٹا ایک طرف رکھ کر ہنس پڑا اور بولا:

" اور پادری تو تمھارا جانی دشمن ہی۔"

ملّاح پن کوف نے اس قول کی تائید کی: "سچی بات ہی۔ اس دم کٹے

گیدڑ کی آنکھ میں تم کانٹے کی طرح کھٹکتے ہو۔"

اس نکتہ چینی کے جواب میں خوکول نے کہا: "تاہم میرے چند دوست بھی ہیں اور تم بھی ان کے دوست بن جاؤ گے۔"

بلا کی سردی تھی۔ آغازِ بہار کا سورج ابھی بجھا بجھا سا تھا۔ دریا کے کنارے بے برگ پیڑوں کی ٹہنیاں ہلکے ہلکے ہل رہی تھیں۔ کہیں کہیں کچھاروں میں برف کی پرتیں مخمل کی طرح بچھی ہوئی تھیں۔ پانی پر برف کے سفید ڈھیلے یوں تیر رہے تھے گویا چراگاہ میں بھیڑیں چر رہی ہوں۔ مجھے اس سارے نظارے پر خواب کا گمان ہوا۔

ککش کن پائپ میں تمباکو بھرے ہوئے فلسفہ بگھارنے لگا: "انجیل میں تو یہی لکھا ہو کہ پادری کو ہر آدمی سے بھائی چارہ برتنا چاہیئے۔"

خوکول نے مسکراکر کہا: "معلوم ہوتا ہو کسی نے تمھاری گوش مالی کی ہو۔"

ککش کن نے جھنجھلاکر کہا: "جی ہاں، چند اٹھائی گیروں سے میری جھڑپ ہوگئی تھی۔" پھر تیور بدل کر بولا: "دراصل، ایک مرتبہ توچیوں نے میری وہ مرمت کی کہ ہنوز حیران ہوں میں زندہ کیسے بچ گیا۔"

"اس مرمت کی شانِ نزول بھی تو بیان کرو۔"

"کل کا قصہ سناؤں یا توچیوں کی یلغار کی داستان بیان کروں۔"

"بھئی، کل تم کس سلسلے میں پٹے؟"

"بھلا پٹنے کے لیے بھی کسی وجہ کی ضرورت ہو۔ انسانوں کا مزاج مینڈھوں کا سا ہو جو دیکھتے ہی ٹکر مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑائی بھڑائی کے سوا انھیں کسی چیز میں مزا نہیں ملتا۔"

لیکن خوکول نے کہا: "میرے خیال میں تو تم اپنی لمبی زبان کی وجہ سے

جو قینچی کی طرح چلتی ہی، پٹتے ہو۔"

گکش کن نے جواب دیا: "تم تو یہی کہو گے۔ میری طبیعت میں تجسّس ہی اور میں ہر چیز کے متعلق سوال پوچھتا ہوں۔ کوئی نئی بات سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہی۔"

اتنے میں بجرا برف کی ایک چٹان سے ٹکرا کر ڈگمگا اُٹھا اور گکش کن چپّو اٹھا کر بھاگا۔

ملّاح پکار اُٹھا: "گکش کن اونگھ تو نہیں رہے ہو۔"

گکش کن نے چڑ کر کہا: "بھئی مجھے باتوں میں نہ لگایا کرو۔ مَیں ایک ساتھ دو دو کام نہیں کر سکتا۔"

ان کی حجّت میں بھی خوش دِلی کا پہلو تھا۔

خوکول کہنے لگا کہ "یہاں کی زمین زرخیز نہیں لیکن باشندے بڑے ذہین ہیں۔" مَیں اس کی ہر بات دھیان سے سُنا کرتا تھا کیوں کہ اس کی متانت اور فصاحت مجھے بھلی لگتی تھی۔ اس کی معلومات میں بڑی وسعت تھی اور انسانوں کو وہ ایک خاص معیار سے جانچا کرتا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہ پوچھا کہ مَیں نے خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی۔ اس قسم کی پوچھ گچھ میرے لیے سوہانِ روح تھی۔ کیوں کہ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مَیں تو اس بھیانک حادثے کو یک سر بھول جانا چاہتا تھا۔ دریا کے آس پاس کے دیس میں اُجالا ہی اُجالا تھا اور وہاں میں ماضی کی کلفتوں کو یاد نہ کرنا چاہتا تھا۔

بجرا کنارے کنارے جا رہا تھا اور اس سے ہٹ کر ندی کا پاٹ سمتِ مخالف کی چراگاہوں تک پھیلا ہوا تھا۔ لہریں پیڑ پودوں میں چھڑکاؤ کرتی جاتی تھیں اور اِدھر اُدھر سے چھوٹے چھوٹے جھرنے اپنے گیت گنگناتے ہوئے

دریا کے دامن میں اپنے موتی رول رہے تھے۔ سورج کی کرنیں کوتوں کے پروں کو چمکا رہی تھیں جو اس وقت گھونسلے بنانے میں مصروف تھے۔ میرا جسم سرد تھا لیکن دِل مسرت سے لبریز تھا کیوں کہ اس میں اُمید کی کرنیں پھوٹنے لگی تھیں۔ بہار کے موسم میں زندہ سلامت رہنا بھی بڑی برکت تھی۔

دوپہر کے وقت ہم اس گانو میں وارد ہوئے۔ سب سے پہلے گرجا گھر کا نیلا گنبد نظر آیا جو ایک اونچی پہاڑی سے آسمان کو جھانک رہا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں کئی پکّے مکان ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ اس نظارے کی سادگی بھی بے حُسن نہیں تھی۔

اس کے بعد مَیں بارہا کشتی پر بیٹھ کر اس گانو کی طرف سے گزرا اور مجھے اس میں ہمیشہ وہی پہلے کی سی دل کشی دِکھلائی دی۔

جب مَیں بجرے کا مال اُتارنے لگا تو خوکول نے کہا: "تمھارے دم خم کا تو مَیں قائل ہو گیا ــــــــ سینے میں درد تو نہیں ہوتا؟"

"نہیں، بالکل نہیں؟"

اس سوال کی نزاکت نے مجھ پر اثر کیا۔ کیوں کہ خودکشی کا راز مَیں ان کسانوں سے چھپانا چاہتا تھا۔

ککش کن بول پڑا: "میاں تم پورے پہلوان ہو ــــــ کہاں کے رہنے والے ہو ــــــ"

ایک اونچا پورا کسان پہاڑی کی چوٹی سے لڑھکتا ہوا جھرنوں پر سے کودتا پھاندتا میدان کی طرف آرہا تھا۔ اس کے پانو ننگے تھے، بال لال اور ڈاڑھی گھونگھروار۔ لباس کے نام پر قمیص اور لنگوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ دریا کے قریب آکر اس نے "خوش آمدید" کا نعرہ بلند کیا۔ آواز میں رس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے دو باکس اُٹھائے اور انھیں تومین پر ٹیک کر اس طرح اُچھلا کہ بجرے کے اندر آرہا۔

وہ بڑا زور آور اور حسین تھا۔ سُرخ و سفید چہرے پر رعب دار نیلی آنکھیں بہت بھلی لگتی تھیں۔

خوکول نے کہا: "عزّت، کہیں تمھیں زکام نہ ہوجائے۔"

"مجھے؟ یار، کہیں مینڈکی کو بھی زکام ہوا ہے۔"

اتنے میں عزّت کی نظر مجھ پر پڑی اور اس نے پوچھا:

"کیا یہ لڑکا دُکان داری کرتا ہے؟"

گُگش کن نے مشورہ دیا "اس سے کشتی لڑو۔"

"پھر بکواس شروع کی" یہ کہہ کر عزّت خوکول کی طرف مخاطب ہوا "گاڑیاں آتی ہی ہوں گی۔ مَیں نے تم لوگوں کو دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ تم آگے چلو، مَیں سامان لدواکر آؤں گا۔"

خوکول سے اس کا رویّہ دوستانہ ہی نہیں بلکہ مربیانہ بھی تھا گو وہ اس سے عمر میں دس سال چھوٹا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مَیں ایک نئے مکان کے دُھلے دھلائے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ در و دیوار سے اب بھی چونے گارے کی بُو آرہی تھی۔ ایک تیز طرّار عورت کھانے کی میز بچھارہی تھی اور خوکول صندوق سے کتابیں نکال کر طاق پر سجارہا تھا۔ اس نے بتلایا کہ میرے قیام کے لیے اوپر کا ایک حجرہ تجویز کیا گیا ہے۔

اپنے حجرے کے روزن سے مَیں گانو کو دیکھ سکتا تھا۔ ہماری جھونپڑی کے عین مقابل ایک کھائی تھی۔ اس کے پرے باغ اور کھیت تھے جن کا سلسلہ

اس جنگل تک چلا گیا تھا جس کی نیلاہٹ افق کے پاس جھلکتی تھی۔ میں نے روزن سے جھانک کر دیکھا تو کوئی کسان ہنسیے سے سبزی کاٹ رہا تھا۔ کوئی گاڑی چرچراتی ہوئی جا رہی تھی اور ایک گائے درد و کرب کے عالم میں کراہ رہی تھی۔ جھرنے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اسی وقت ایک سیاہ پوش بڑھیا نے اپنے دروازے سے نکل کر للکارا: "تم پر خدا کی لعنت!"

دو لڑکے مٹی پتھر کا ڈھیر لگائے جھرنے کو باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑھیا کی للکار سنتے ہی وہ سر پر پانو رکھ کر چمپت ہو گئے۔ بڑھیا نے ایک تنکا اٹھا کر اس پر تھوکا اور پانی میں پھینک دیا۔ پھر اپنے مردانا جوتوں کی ٹھوکر سے بند کو توڑ کر چلتی بنی۔

اس گانو میں میری زندگی کا کیا ڈھنگ ہوگا؟ میں اس خیال میں کھو گیا۔ اتنے میں آواز آئی کھانا تیار ہے۔ نیچے عزت ٹانگیں پسارے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کچھ کہتے کہتے مجھے دیکھ کر رُک گیا۔

خوکول نے ناک بھنوں چڑھا کر کہا: "چپ کیوں ہو گئے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ سب کچھ تمھیں سُنا ہی چکا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اپنا انتظام خود کرو۔ تم پستول یا لاٹھی کے بغیر گھر سے نہ نکلا کرو۔"

خوکول غریب کسانوں کی تنظیم اور سود خواروں سے ان کی نجات کی ضرورت بیان کرنے لگا۔ عزت غور سے اس کی باتیں سنتا رہا اور بولا: "لیکن وہ سُود خوار تمھیں چین سے روزی نہ کمانے دیں گے۔"

"دیکھا جائے گا۔"

"بے شک۔ ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔"

میں سوچنے لگا کہ کیا واقعتاً میں نے زندگی کا کوئی مقصد تلاش کر لیا ہے۔

کھانا ختم کرکے عزّت نے کہا: "بھائی، جلد بازی سے کام نہ چلے گا، ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو خوخول نے کہا: "یہ آدمی مخلص اور سمجھدار ہے۔ مگر افسوس کہ نِرا اَن پڑھ ہے۔ پڑھنے کا اسے بڑا شوق ہے اور تم اس کی مدد کرسکو تو اچھا ہو۔"

دیر تک وہ مجھے دُکان کی چیزوں کا مول بھاؤ سمجھاتا رہا۔

"گانو میں دو دُکان دار اور ہیں۔ میں ان سے کم قیمت پر سودا بیچتا ہوں۔ اور اس لیے وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ مجھے ہر طرح دِق کرتے ہیں بلکہ پٹوانے کی ترکیب بھی کیا کرتے ہیں۔ میں یہاں رُپیہ کمانے کے لیے نہیں رہتا۔ بلکہ میرے قیام کی ایک خاص وجہ ہے۔ اسے میرا خبط سمجھو یعنی جیسے تم تنور خانے میں تھے۔"

میں اس کا مفہوم سمجھ گیا۔

"ہمیں انسانوں کو بیدار کرنا ہے۔"

دُکان بند تھی۔ ہم چراغ لے کر اس کا طواف کرتے رہے۔ سڑک پر ہم نے کسی کے قدموں کی چاپ سُنی جو چوروں کی طرح پنجوں کے بل چل رہا تھا۔

"پانو کی آہٹ سُنائی دے رہی ہے؟ یہ بھک منگا گمن ہے۔ بڑا بدذات ہے۔ اور دوسروں کو دق کرنے میں اسے مزا ملتا ہے۔ اس سے بہت ہوشیار رہنا۔۔۔"

اس کے بعد وہ گول کمرے میں بیٹھ کر پائپ پینے لگا۔ اس کی پیٹھ تنور سے ٹکی ہوئی اور آنکھیں ذرا ذرا بند تھیں۔ دھوئیں کے کش ڈاڑھی میں بکھیرتے ہوئے وہ اپنی مخصوص سیدھی سادی زبان میں کہنے لگا کہ کس طرح بہت مدّت پہلے میں محسوس کررہا تھا کہ تم جوانی کے دن بےکار ضائع کررہے ہو۔ تمھاری ذہانت میں کوئی شبہ نہیں۔ تمھاری طبیعت میں ضد اور ارادوں میں بلندی ہے۔ کتابوں سے

ضرور دِل لگاؤ لیکن چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسانوں کو نہ بھول جاؤ۔ یہ کہاوت یاد رکھو کہ سارے علم کا جنم داتا انسان ہی۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب انسان سے بہتر اُستاد ہی لیکن انسان سے جو کچھ سیکھا جاتا ہی اس کا اثر دُور رس اور دیرپا ہوتا ہی۔"

اس نے میری اس رائے کو دہرایا کہ دیہاتوں میں علم کی روشنی پہنچانا چاہیے۔ لیکن اس کی باتیں خلوص میں سموئی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ان میں ایک نئی کیفیت پیدا ہوگئی تھی: "تم نے طلبہ کو یہ کہتے سُنا ہوگا کہ عوام سے محبت کرنا چاہیے۔ مجھ سے پوچھو تو عوام سے محبت کرنا ممکن ہی نہیں۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ محبت میں تسلیم و رضا اور درگزر کے عناصر ہوتے ہیں۔ صرف عورتوں سے اس قسم کی محبت کی جاسکتی ہی۔ لیکن عوام کی حماقت، جہالت اور غلاظت کو نہ روا رکھا جاسکتا ہی نہ معاف کیا جاسکتا ہی۔ ہمیں کسانوں سے کہنا چاہیے۔ کہ ان کی زندگی نہایت کریہہ ہی اور انھیں ایک بہتر نظام کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ جھوٹ موٹ ان کی تعریف کی کوئی ضرورت نہیں۔"

چائے پیتے وقت اس نے مجھے اپنی رام کہانی سنائی۔ اس کا باپ لوہار تھا۔ اور وہ خود کسی اسٹیشن پر ریل گاڑیوں کی جھاڑ پونچھ کیا کرتا تھا۔ وہاں انقلابیوں سے اس کا تعلق ہوگیا اور اس نے مزدوروں کی تنظیم شروع کی۔ پولیس نے اسے پکڑ کر دو سال جیل میں بند رکھا اور پھر دس سال کے لیے سائبیریا بھیج دیا۔

"وہاں شروع شروع میں مجھے خانہ بدوشوں کی بستی میں رہنا پڑا۔ اس زمانے میں مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا کہ اب میری موت میں دیر نہیں۔ سردی اس غضب کی تھی کہ دماغ کو پالا سا مار جاتا تھا۔ لیکن وہاں کے لوگوں کو میں نے

نہایت ذہین پایا۔ اس علاقے میں بہت کم روسیوں سے ملاقات ہوئی لیکن انھیں تنہائی سے بچانے کے لیے ان کی تعداد برابر بڑھائی جارہی تھی۔ یہ سب کے سب بڑے شریف اور نیک تھے۔ ان میں ایک طالب علم کورولینکو* نامی تھا جو میرے ساتھ دیس لوٹ آیا ہے۔ ہم میں خوب بنتی تھی اور کئی معاملات میں ہم دونوں ہم رائے اور ہم ذوق تھے گو یہ سچ ہے کہ دوستی کے لیے ہم آہنگی ضروری نہیں۔ اس کی سنجیدگی اور ہوشیاری میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ ہرفن مولا تھا حتیٰ کہ مریم کے بت تراشنے کا سلیقہ بھی رکھتا تھا گو مجھے اس شغل سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ سُنا ہے کہ اخبار نویسی میں اس نے شہرت حاصل کرلی ہے۔"

آدھی رات تک وہ گپ شپ کرتا رہا جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ میں اس سے بے تکلف ہوجاؤں۔ دراصل آج تک کوئی آدمی مجھ سے اس طرح گھل کر نہ ملا تھا۔ خودکشی کی ناکام کوشش کے بعد میں آپ اپنی نگاہ میں ذلیل ہوگیا تھا اور زندگی میرے لیے سراسر عذاب ہوگئی تھی۔ خوخول نے یقیناً میری روحانی اُلجھن کو محسوس کیا اور اپنی زندگی میں داخل کرکے ازسرِنو مجھے تازہ دم کیا۔ وہ دن مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

اتوار کو جب ہماری دُکان کھلی تو کسانوں کی بھیڑ لگ گئی۔ سب سے پہلے آنے والے کا نام باری نوف تھا۔ عجب سڑا بُسا آدمی تھا۔ بانہیں بندر کی سی لیکن آنکھیں خوب صورت جن میں وحشت چمک رہی تھی۔

سلام دعا کے بعد اس نے شہر کی خبر پوچھی۔ لیکن جواب سُننے سے پہلے گکش کن کو اطلاع دی: "تمھاری بلیوں نے پھر ایک مُرغ کا صفایا کردیا۔"

---

* بعد ازاں اس نے روس میں مصنف کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی اور گورکی کی سرپرستی بھی اسی نے کی۔

پھر وہ کہنے لگا کہ صوبے کا گورنر زار کے حضور میں یہ التجا کرنے لگا کہ پاس پڑوس کے تاتاریوں کو کوہ قاف اور ترکستان پہنچا دیا جائے۔ باری نوف کسان گورنر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا:

"بڑا سیانا ہے، اپنا کام خوب جانتا ہے۔"

لیکن خوکول نے اس کی بات کاٹ دی: "یہ سب من گھڑت ہے۔"

"کس کی من کی گھڑت؟"

"میں کیا جانوں"

کسان نے آزردگی سے سر ہلا کر کہا: "تمھیں انسانوں کے قول پر اعتبار نہیں۔ بہرحال مجھے تاتاریوں سے ہمدردی ہے۔ کوہِ قاف میں پریوں کے ساتھ جن بھی رہتے ہیں۔"

ایک دبلا پتلا آدمی کسی دوسرے کا پھٹا ہوا اوورکوٹ پہنے قریب آیا۔ اس کا مہیب چہرا برابر اینٹھتا رہتا تھا جس کی وجہ سے ہونٹوں پر تبسم کا گمان ہوسکتا تھا۔ بائیں آنکھ ہمیشہ پھڑکتی رہتی تھی جس سے اوپر کی بھنووں میں تھرتھراہٹ ہوتی رہتی تھی۔

باری نوف نے طنزاً کہا: "مگن میاں، آداب قبول فرمائیں۔ یہ تو کہیے کہ کل رات کس کے مال پر ہاتھ صاف کیا؟"

مگن نے تڑاق سے جواب دیا: "تمھارے مال پر۔"

اسی وقت ہمارا پڑوسی سنکوف گلے میں سرخ رومال باندھے، پاؤں میں ربر کے گلوش پہنے اور چھاتی پر چاندی کی زنجیر لٹکائے برآمد ہوا۔ مگن کو غصے سے گھور کر بولا: "بڈھے خبیث، اگر تو نے میرے باغ میں گھسنے کی کوشش کی تو دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

گمن نے اطمینان کی سانس بھر کر کہا: "وہی پُرانی بکواس، لیکن سچ ہے بھائی۔ جب تک مار پیٹ نہ کرو کھانا کیسے ہضم ہو۔"

ین کوف گالی گلوج پر اُتر آیا۔ لیکن گمن نے کہا: "مجھے بوڑھا کون کہتا ہے۔ میری عمر صرف چھیالیس سال ہے۔"

اب باری نوف کی باری آئی: "جھوٹے کہیں کے۔ اس دن تو نے اپنی عمر تریپن سال بتلائی تھی۔ کبھی تو سچ بولا کر۔"

اتنے میں ایک ڈڑھیل بوڑھا سس لوف سانجھی عزّت کے ساتھ پہنچا اور اچھا خاصا جم گھٹ ہو گیا۔ خوکول دُکان کی سیڑھیوں پر بیٹھا پائپ پیتے ہوئے کسانوں کی واہی تباہی باتوں کو چُپ چاپ سُن رہا تھا اور وہ سب برساتی میں دائیں بائیں دو بنچوں پر ڈٹے ہوئے تھے۔

دھوپ چھانو کا دن تھا اور سرد نیلے آسمان پر بادل کبھی سورج کو چھپاتے اور کبھی ظاہر کر دیتے تھے۔ پانی پر جب دھوپ پڑتی تو آنکھیں چوندھیا جاتیں اور جب چھانو آتی تو آنکھوں کو آرام ملتا۔

چند خوش لباس لڑکیاں ہرنیوں کی طرح سڑک پر محوِ خرام تھیں۔ لڑکے مچھلی پکڑنے کی بنسیاں کاندھوں پر لادے بھاگ رہے تھے۔ مسٹنڈے کسان ہماری محفل کو ذرا تعجب سے دیکھتے ہوئے اپنی راہ چلے جاتے تھے۔

گمن اور گکش کن اس بحث میں اُلجھے ہوئے تھے کہ تاجر اور نواب کی لڑائی میں کس کی جیت ہو گی۔ گکش کن تاجر کا مؤید تھا لیکن گمن بڑے زور شور سے نواب کی حمایت کر رہا تھا: "نپولین بونا پارٹ کا باپ فلاں تاجر کی ڈاڑھی پکڑ کر ہلا دیتا تھا گو اس میں اتنی طاقت تھی کہ دو پہلوانوں کو بہ یک وقت چت کر سکتا تھا۔"

سس لوف کسان نے بیزاری کی آواز میں کہا: "کسان کبھی نہیں پنپ سکتے جاگیرداری کے زمانے میں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی لیکن ہر غلام کا کام بندھا بندھایا تھا"

عزت نے بگڑ کر کہا: "تو پھر سے غلام کیوں نہیں بن جاتے"

خوکول نے پُرمعنی طریق سے اُسے دیکھا اور چُپ چاپ پائپ صاف کرنے لگا۔ مَیں بے صبری سے اس گھڑی کا انتظار کرنے لگا جب خوکول کچھ کہے گا مَیں سوچنے لگا کہ وہ فلاں فلاں موقع پر اپنے خیالات ظاہر کر سکتا تھا لیکن جانے کیوں اس نے کچھ نہ کہا۔ لیکن وہ تو پیکرِ تصویر بنا پانی اور بادل سے ہَوا کے کھیل کو دیکھ رہا تھا۔ ندی میں گزرتے ہوئے کسی اگن بوٹ سے عورتوں کے بےسُرے گیت کا شور اُٹھ رہا تھا۔ کوئی متوالا سڑک پر بکتا جھکتا لڑکھڑاتا جا رہا تھا اور بار بار کیچڑ میں گر پڑتا تھا۔

اِس دوران میں کسانوں کی بات چیت کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے الفاظ میں ایک قسم کی اُداسی تھی۔ اس کا اثر مجھ پر بھی ہونے لگا۔ کسی حد تک اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ موسم نہایت ناخوش گوار تھا اور دُوسرے یہ کہ مجھے شہر کی گھما گھمی اور وہاں کی پُررونق صحبتیں یاد آ رہی تھیں۔

شام کو مَیں نے خوکول سے پوچھا کہ کسانوں کی موجودگی میں وہ اس قدر خاموش کیوں تھا۔

"اوہو، اگر مَیں ان سے سڑک پر بیٹھ کر بےدھڑک باتیں کرنے لگوں تو دُوسرے دن سیدھے سائبیریا پہنچا دیا جاؤں"

پائپ سلگا کر وہ دھوئیں کے بادل میں کھو گیا۔ پھر وہ مجھے سمجھانے لگا کہ کسان طبعاً نہایت شکی ہوتا ہے: "اجنبیوں کا ذِکر ہی کیا وہ پڑوسیوں اور اپنے آپ سے بھی خائف رہتا ہے۔ ابھی تیس سال پہلے تک وہ جاگیرداروں کا غلام تھا یعنی ہر چالیس سالہ کسان پیدائشی غلام ہے اور اسے یہ بات یاد ہے۔ آزادی کا سیدھا

سادا مطلب یہی ہی کہ میں جس طرح چاہوں اپنی زندگی گزاروں۔ لیکن دیس بھر میں جسے دیکھو کسان کو دبانے پر تُلا ہوا ہی۔ پہلے کسانوں کے بہت سے مالک تھے لیکن اب ان کا مالک ایک ہی اور وہ زار ہی۔ کسانوں کے خیال میں وہ سارے جہان کا مالک ہی اور کسی نہ کسی دن انھیں آزادی کی نعمتوں سے مالا مال کردے گا۔ وہ سوچتے ہیں کہ کئی مالکوں سے ایک بہرحال بہتر ہی۔ وہ اس دن کے منتظر ہیں جب زار آزادی کا اعلان کرے گا اور ہر ایک جو چاہے گا حاصل کر سکے گا۔ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی نیت پر شبہ ہی کہ کہیں عین موقع پر لوٹ کا سارا مال لےکر چلتا نہ بنے۔ اور اسے خود پر اعتبار نہیں کہ کہیں موقع پر چوک نہ جائے سب اسی دن کے لیے اپنی اپنی تلواریں تیز کر رہے ہیں۔ ملک بھر کی یہی کیفیت ہی۔ زار کے مخالف ہوں یا کسانوں کے، سب کو اسی دن کا انتظار ہی۔ لیکن طوائف الملوکی میں زندگی محال ہوگی۔ یہ سب آپس میں لڑکر فنا ہوجائیں گے۔"

ہَوا کے زور سے بند کھڑکی کے پٹوں پر مینھ کے چھینٹے زور سے ٹکرا رہے تھے۔ باہر فضا کہر میں لپٹی ہوئی تھی اور میرا دِل بھی غبار آلود ہو رہا تھا۔ خوکول نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا "کسان کو سمجھاؤ کہ آہستہ آہستہ زار کی ساری طاقت پر قبضہ کرلے۔ اسے بتلاؤ کہ زار اور تمام حاکموں کے انتخاب کا اختیار عوام کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔"

"اس کے لیے تو سو سال کی مدت درکار ہی۔"

"تو کیا تم سمجھے تھے کہ یہ ایک دن کا کام ہی۔"

شام کو وہ کہیں چلا گیا اور آدھی رات کو میں نے گھر کے پاس بندوق کی آواز سُنی۔

مَیں بھری برسات میں سڑک پر نکل آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خوکول کیچڑ سے

بچتے بچاتے سنبھل سنبھل کر دروازے کی طرف آرہا ہے۔

"کوئی بات نہیں۔ بندوق میں نے چلائی تھی۔"

"کس پر؟"

"اس جگہ کچھ لوگوں نے مجھ پر حملے کی کوشش کی اور تاکید کے باوجود اپنی حرکت سے باز نہ آئے۔ چناں چہ انھیں ڈرانے کے لیے میں نے اوپر گولی چلادی۔"

اندر آکر وہ کپڑے اُتارتے اور ڈاڑھی سے پانی نچوڑتے ہوئے یوں ناک بجانے لگا گویا گھوڑا ہنہنا رہا ہو۔ "جوتوں کا تلا پھٹ گیا ہے۔ انھیں بدلنا ہوگا۔ تمھیں بندوق صاف کرنا تو آتا ہی ہوگا؟ اسے صاف نہ رکھا جائے تو زنگ لگ جاتا ہے۔ فلیتے کو مٹّی کے تیل سے بھگولو۔"

اسے اپنے اوپر اس قدر اعتماد اور قابو تھا کہ میں دنگ رہ گیا۔ آئینے کے سامنے ڈاڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے اس نے تاکید کی کہ باہر آتے جاتے وقت چوکس رہو اور خاص کر چھٹّی کی شام کو قتل کی رات سمجھو: "اندھیرے میں وہ تم پر بھی حملہ کر بیٹھیں تو حیرت کا مقام نہیں۔ لیکن ڈنڈا لیے پھرنے کی ضرورت نہیں ورنہ شہدوں کو غصّہ آئے گا اور وہ سمجھیں گے تم ڈرے ہوئے ہو۔ یوں ان سے گھبرانا نہ چاہیے کیوں کہ وہ بڑے بزدل ہیں۔"

زندگی کا یہ دوَر مسرت انگیز تھا کیوں کہ ہر روز نئی نئی معلومات کا پیامی تھا۔ خوکول کی نگرانی میں میں نے ذوق وشوق سے سائنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کردیا۔

ہفتے میں تین دن شام کے وقت عزت تعلیم کی غرض سے آیا کرتا تھا

پہلے تو وہ مجھ سے حقارت سے پیش آتا تھا لیکن چند سبق حاصل کرنے کے بعد اس کا رویّہ بدلا۔ اور وہ مسکرا کر بولا:

"تمھیں بات کو سلجھا کر سمجھانے کا ڈھب آتا ہے۔ میاں، تمھیں تو اسکول کا ماسٹر ہونا چاہیے۔" یک بہ یک وہ کہہ اٹھا: "تم تو پہلوان معلوم ہوتے ہو، آؤ ذرا زور آزمائی ہو جائے۔"

آنگن میں جا کر ہم دونوں نے زمین پکڑ لی اور ایک دوسرے کو زمین سے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ خوکول ہم دونوں کو للکارنے لگا۔

آخر کار عزّت نے مجھے اوپر اُٹھا لیا اور اس کامیابی نے میری وقعت میں اضافہ کر دیا۔ دلاسا دینے کے لیے وہ بولا: "کوئی پروا نہیں۔ تم ہو مہابلی۔ کیا افسوس ہے کہ تمھیں مچھلی کے شکار کا شوق نہیں ورنہ تمھیں دولگا کی سیر کراتا۔ رات کے وقت دولگا کا سماں فردوسِ بریں سے کم دل کش نہیں ہوتا۔"

پڑھائی میں وہ محنت کرتا تھا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اتنی ترقّی کر لی کہ خود حیرت زدہ رہ گیا۔ بیچ بیچ میں وہ الماری سے کوئی کتاب نکال کر اٹک اٹک کر اس کے دو تین جُملے پڑھ جاتا تھا۔ پھر کچھ شرما کر کہتا "بھئی دیکھو، میں شُدبُد تو ہو ہی گیا ہوں۔"

کئی مرتبہ اس نے مجھ سے پوچھا: "خدا کے لیے سمجھاؤ کہ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے۔ چند لکیروں اور دائروں کو جمع کرنے سے جیتے جاگتے الفاظ کیسے بن جاتے ہیں۔ تصویریں ہوتیں تو بھی کوئی بات تھی۔ لیکن قلم کے ذرا سے ہیر پھیر سے ان میں مطالب کیسے پیدا ہو جاتے ہیں۔"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑتا اور یہی کہتے بنتی کہ "یہ رمز میری عقل

سے بالاتر ہو۔"

روشنی میں کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے وہ بول اٹھتا: "جادو کا کھیل!" اس کی سادگی میں بڑی کشش تھی اور اس کی شخصیت میں طفلانہ معصومیت تھی۔ تمام ماہی گیروں کی طرح وہ بھی طبعاً شاعر تھا۔ تنہائی، خاموشی اور دریا کی زندگی سے اسے دِلی اُنس تھا۔

ستاروں کی طرف دیکھ کر وہ کہا کرتا: "خوکول کا خیال ہو کہ تاروں میں شاید ہم جیسے جان دار رہتے ہیں۔ تمھاری کیا رائے ہو؟ کاش ہم ان سے پوچھ سکتے کہ وہاں کیسی گزرتی ہو۔ شاید وہ ہم سے بہتر اور خوش تر زندگی بسر کرتے ہوں۔"

لیکن درحقیقت اسے اپنی زندگی پسند تھی۔ وہ یتیم تھا اور اب بھی محتاج تھا۔ لیکن ماہی گیری کا پیشہ اسے جی جان سے مرغوب تھا۔ کسانوں کو وہ حقیر جانتا اور ہمیشہ ان کے خلاف پرچار کیا کرتا تھا:

"ان کی نرمی پر نہ جانا۔ بڑے مکار اور فریبی ہوتے ہیں۔ آج وہ تمھارے دوست ہیں لیکن کل تمھارا گلا گھونٹنے پر تیار ہو جائیں گے اپنے سوا انھیں کسی کی فکر نہیں اور خدمتِ خلق کو وہ محض حماقت سمجھتے ہیں۔"

بنیوں سے اسے انتہائی نفرت تھی اور مجھے تعجب ہوتا کہ اس قدر نرم دل آدمی میں اتنی تلخی کہاں سے آگئی: "وہ دولت مند اس لیے ہیں کہ دوسروں سے زیادہ چالاک ہیں۔ کسانوں کی نجات کا صرف یہی طریقہ ہو کہ وہ متحد ہو جائیں۔ لیکن یہ کم بخت خود اپنے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور بے چارے خوکول کو دیکھو کہ ان کے بھلے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کیے دیتا ہو۔"

عورتیں اس کی طاقت اور خوب صورتی پر مرتی تھیں اور اس کے جا د

بے جا برتاؤ کو روا رکھتی تھیں۔

عزت سیدھے پن سے اقرار کرتا: "میری مٹی پلید ہو رہی ہے۔ ان عورتوں کو اپنے شوہروں کی آبرو کا بھی پاس نہیں۔ لیکن ان پر رحم بھی آتا ہے۔ ان کی زندگی کس قدر رُوکھی پھیکی ہے۔ دن رات جانوروں کی طرح کام کیے جاتی ہیں۔ ان کے شوہروں کے پاس پیار محبت کے لیے فرصت کہاں۔ لیکن مَیں ٹھیرا کنوارا۔ شادی کے بعد عورتوں کو مردوں سے مار پیٹ کے سوا کیا مِلتا ہے مَیں ان سے مہربانی اور محبت سے پیش آتا ہوں۔ مَیں ان سے صِرف یہ کہتا ہوں کہ ایک دُوسرے سے رشک نہ کرو۔ مَیں تم سب کے لیے کافی ہوں اور سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہوں۔"

ذرا شرما کر وہ ڈاڑھی سلجھانے لگا اور پھر یہ قصّہ سُنایا:

"کئی سال کی بات ہے کہ شہر کی کوئی بیگم اپنی زمیں داری دیکھنے آئیں۔ اس کے حُسن کی پھبن بیان سے باہر ہے۔ چمپئی رنگ، سنہرے بال اور سمندری آنکھیں۔ مَیں مچھلی لے کر اس کے گھر جاتا اور سارے وقت آنکھیں سینکا کرتا۔ ایک بار اس نے پوچھا کہ تم چاہتے کیا ہو۔ مَیں نے کہا کہ آپ میرے دل کا حال جانتی ہیں۔ وہ بولی اچھا مَیں آج رات تمھارے پاس آؤں گی۔ سج بن کر وہ رات کو میرا بستر گرم کرنے آئی۔ لیکن کھٹملوں نے اسے اتنا کاٹا کہ وہ بدک گئی اور رونے لگی۔ افسوس کہ دُوسرے دن اس کا میاں جو کوئی جج تھا وارد ہو گیا۔ ذرا ان بیگموں کی نزاکت دیکھو کہ کھٹمل انھیں آرام سے سونے بھی نہیں دیتے۔"

لکش کن کی تعریف ہمیشہ عزت کی زبان پر رہتی تھی: "یہ کسان بڑا بھلا مانس ہے۔ لوگ اسے بُرا سمجھتے ہیں لیکن یہ ان کی خباثت کی دلیل ہے۔

اس میں ایک عیب ہے۔ بڑا باتونی ہے لیکن عیب کس میں نہیں۔"

گکش کن کی اپنی کوئی زمین نہ تھی۔ اس نے ایک شرابی مزدورنی سے شادی کرلی تھی جو بلا کی چنچل اور بدزبان تھی۔ گکش کن کو خبریں سننے سنانے کا بڑا شوق تھا۔ جب کوئی خبر نہ ہوتی تو خود کئی افواہیں گھڑ لیتا اور انھیں ایک سانس میں سنا ڈالتا:

"بھائی خوکول تم نے کچھ سنا، گانو کا چوکی دار راہب بن کر خانقاہ کی راہ لینے والا ہے۔ کہتا ہے کہ میں کسانوں کا صبر اپنے سر کیوں لوں۔ چلو، اس سے تو نجات مل جائے گی۔"

خوکول نے ٹوک کر کہا: "تو گویا ساری حکومت فنا ہو جائے گی۔"

بال اور کپڑوں سے گھاس پھوس جھاڑتے ہوئے گکش کن فکر میں پڑ گیا۔

"یہ تو نہ ہوگا۔ لیکن جن حاکموں میں ذرا بھی ضمیر ہے وہ زیادہ عرصے کام نہ کرسکیں گے۔ تم ضمیر کے وجود سے انکار کرو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔" یہ کہ کر اس نے ایک آوارہ امیرزادی کا قصّہ شروع کیا:

"اس کی بدکاری کا چرچا دور دور تھا۔ اور صوبے دار دق ہوکر اس کے گھر تنبیہ کرنے آیا کہ راج دھانی تک میں تمھاری آوارگی کا ذکر ہے اس لیے اب بھی راہ پر آجاؤ۔ لیکن اس بجلی بسنت کو دیکھو کہ اسے بھی نخرے تلّے دکھلاکر ٹرخادیا اور پھر اپنے کاروبار میں مشغول ہوگئی۔ لیکن چند سال بعد اس میں ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ ایک روز کسانوں کو جمع کرکے اپنا دھن مال ان میں بانٹنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اعلان کیا کہ میں خود ــــــــ"

خوکول نے بات کاٹ کر کہا: "جوگن بن کر نکل جاؤں گی۔"

گگش کن نے مشتبہ نگاہوں سے اسے گھور کر پوچھا :

"معلوم ہوتا ہے تم پہلے بھی یہ حکایت سُن چکے ہو؟"

"کبھی نہیں۔"

"تو تمھیں اس کا علم کیسے ہوا؟"

"میں اسے نہیں تو تمھیں خوب جانتا ہوں۔"

گگش کن نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا: "یار بڑے شکّی ہو۔"

گگش کن کی حکایتوں کا انجام عموماً یہی ہوا کرتا تھا۔ بدکار اور آوارہ آدمی اپنے گناہوں سے توبہ کر کے خانقاہ کے حجروں میں جا بیٹھتے تھے اسی طرح جیسے غلاظت گھوم پھر کر ناب دان میں جمع ہو جاتی ہے۔

اس کے دماغ میں عجیب و غریب خیالات کا انبار لگا رہتا تھا۔ اچانک یا تو بہتک کر وہ بول اُٹھتا: "تاتاریوں کو جیت کر ہم نے سراسر ظلم کیا۔ ہر حال میں وہ ہم سے افضل ہیں۔"

خدا جانے اسے تاتاریوں کا خیال کیوں کر آ گیا کیوں کہ اس وقت کسان سبھا قائم کرنے کی تجویز ہو رہی تھی۔

خوکول سائبیریا اور وہاں کے خوش حال کسانوں کا حال سُنا رہا تھا۔ لیکن گگش کن نے یک بہ یک یہ جملہ تراشا: "اگر دو تین سال مچھلیاں نہ پکڑی جائیں تو ان کی کثرت سے سمندر کی سطح اونچی ہو جائے گی اور ساری دنیا میں سیلاب آ جائے گا!"

دیہاتیوں کی رائے میں گگش کن نرا بوڑم تھا۔ اس کی بکواس اور غپ بازی پر وہ سخت چراغ پا ہوتے تھے۔ لیکن وہ جو کہتا پہلے اسے دھیان سے سُنتے تھے کہ شاید وہ غلطی سے پتے کی کوئی بات کہہ جائے۔

ورنہ لگش کن کی ہوشیاری میں کوئی کلام نہیں ۔ جو کام بھی اس کے سپرد کردیا جائے دیر سویر بہ حسن و خوبی انجام پاجاتا تھا ۔ چوب کاری اور نعل بندی میں وہ اُستاد تھا ۔ اور مُرغیاں اور شہد کی مکھیاں پالنے کا طریقہ بھی اسے خوب یاد تھا ۔ بلیوں سے اسے اُلفت تھی ۔ اور کم نہ زیادہ پوری دس بلیاں بچّوں سمیت اس کے غُسل خانے میں چین کی بنسی بجاتی تھیں ۔ ان کے لیے لگش کن نے کووں کے راشن کا انتظام کر رکھا تھا ۔ انھیں اس نے مرغیوں کے شکار کا سبق بھی دیا تھا ۔ یہ ایک مزید وجہ گانو میں اس کی غیر مقبولیت کی تھی ۔ مرغیوں کے قتل کی پاداش میں عورتیں بلیوں کی جان کی لاگو بن گئیں اور انھیں بے کھٹکے موت کے گھاٹ اُتار دیتی تھیں ۔ غسل خانے کے آس پاس اکثر عورتوں کے کوسنے کی آواز آیا کرتی لیکن لگش کن پر ان کا مطلق اثر نہ ہوتا ۔ "بے وقوفو، بلّی کتّے سے زیادہ چالاک اور فطرتاً شکاری ہے ۔ میں ایک سو بلیاں پالوں گا ۔ اور انھیں سکھا پڑھا کر بیچ دوں گا ۔ یہ رُپے تمھیں ہی ملیں گے ۔"

وہ سارا لکھا پڑھا بھول گیا تھا اور اس کا اسے کوئی افسوس بھی نہ تھا ۔ یوں اس کی ذہانت میں کوئی شبہ نہیں اور وہ دوسروں سے پہلے خوکول کی باتوں کا اصل مطلب تاڑ جاتا تھا ۔

وہ عزّت اور پن کوف کے ساتھ شام کو ہمارے گھر آتا ۔ اور تینوں آدھی رات تک بیٹھے کائنات کی تخلیق دیس بہ دیس کی انقلابی تحریکوں اور غیر ممالک کے متعلق خوکول کی دھنواں دھار تقریریں سُنا کرتے ۔ مجھے یاد ہے کہ انقلابِ فرانس کے تذکرے سے پن کوف کو بڑا جوش آیا اور وہ بولا: "زندگی میں ایسی ہی تبدیلی کی ضرورت ہے ۔"

دو سال پہلے وہ اپنے باپ سے علاحدہ ہوگیا تھا ۔ اس بڈھے کا شما

امیر کسانوں میں ہوتا تھا۔ عزت کی یتیم بھانجی پر یہ عاشق ہوگیا۔ جب شادی ہوگئی تو اسے سجا بنا کر گھر میں بٹھایا اور دن رات اس کی چوکی داری کرنے لگا۔ پن کوف کی ہٹ دھرمی پر بوڑھا آگ ببولا ہوگیا اور جب کبھی اس کے جھونپڑے کے سامنے سے گزرتا کھکھار کر تھوکنا کبھی نہ بھولتا۔ پن کوف نے اپنی جھونپڑی خوکول کو کرائے پر دے دی بلکہ اس کے لیے ایک دُکان بھی بنادی جس کے سبب سے گانو کے ساہوکار جل بھن کر کباب ہوگئے۔ وہ ان کی کارستانیوں کی کوئی پروا نہ کرتا اور ان سے ہمیشہ حقارت سے پیش آتا تھا۔ دیہات کی زندگی سے اسے نفرت تھی اور اس کی واحد تمنا یہ تھی کہ کوئی ہُنر آجائے تو شہر جاکر رہنے لگے۔

اس کے ڈیل ڈول میں تناسب تھا اور وہ خوش لباس تھا اور طبعاً مغرور اور شکّی بھی۔

خوکول سے اس نے پوچھا: "زندگی کا یہ انداز تم نے سوچ سمجھ کر اختیار کیا یا دِل کی کسی اُمنگ کے تحت؟"

"تمھاری کیا رائے ہے؟"

پن کوف: "جواب تم دوگے یا نہیں؟"

"تم بھی تو قیاس لگاؤ۔"

پن کوف نے مجبوراً اپنی رائے ظاہر کی: "دماغ کے مشورے پر عمل کرنا بہرصورت صائب ہے۔ دل کو نادان دوست سمجھنا چاہیے۔ اگر میں دِل کی ہر ضد کو پورا کرنے بیٹھتا تو خدا جانے کیسی درگت ہوتی۔ شاید دخل درمعقولات کے عوض پادری کی ڈاڑھی میں آگ لگادیتا۔"

اس پادری نے جو بڑا بدباطن اور بھوتنی بھلا تھا باپ بیٹے کی

لڑائی میں حصہ لے کر پن کوف کو بے حد برافروختہ کردیا تھا۔

شروع شروع میں پن کوف خواہ مخواہ مجھ سے بڑی طرح پیش آتا تھا۔ مجھ پر یوں دھونس جماتا گویا میں اسی کا نمک کھاتا ہوں۔ یہ رویّہ تو اس نے چند روز بعد بدل دیا تاہم مجھے یہی وسوسہ رہا کہ دِل میں وہ مجھ سے کدورت رکھتا ہے۔ میرا دِل بھی اس کی طرف سے صاف نہ ہوا۔

اس چھوٹے سے دُھلے دُھلائے کمرے میں شام کو جو صحبتیں ہوا کرتی تھیں ان کی یاد مجھے ہمیشہ عزیز رہے گی۔ کھڑکیاں بند ہیں اور کونے کی میز پر لیمپ روشن ہے۔ اس کے سامنے ایک اونچا پُورا ڈِھیل آدمی کھڑا ہوا ہے۔ وہ کہ رہا ہے: "زندگی کی یہ صفت نہایت اہم ہے کہ روز بروز جانوروں اور انسانوں کا فرق بڑھتا جاتا ہے۔"

تینوں دیہاتی غور سے اس کی باتیں سُن رہے ہیں۔ چہرے اور آنکھوں سے تینوں ذہین معلوم ہوتے ہیں۔ عزّت یوں بُت بنا بیٹھا ہے گویا دُور سے آتی ہوئی کسی آواز کو سُن رہا ہے۔ کُکُش کِن یوں پہلو بدل رہا ہے گویا اسے پسّو کاٹ رہے ہوں۔ پن کوف مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا سنجیدگی سے کہتا ہے: "اس گفتگو کا ماحصل یہی ہے کہ طبقہ بندی نے سماج کے شیرازے کو پراگندہ کردیا۔"

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ گو کُکُش کِن پن کوف کا ملازم تھا لیکن وہ اس سے کبھی کوئی کھوٹی بات نہ کہتا بلکہ اس شیخ چلّی کی باتوں کو دھیان سے سُنتا تھا۔

جب محفل برخاست ہوجاتی تو میں اپنی کوٹھری میں کھڑکی کھول کر جا بیٹھتا۔ اور دیر تک نیند کے ماتے گانو اور سنسان کھیتوں کو تاکا کرتا۔ کہر کی چادر کو پھاڑ کر ستاروں کی مدھم جوت زمین تک اُتر آتی تھی۔ یہ سکون میرے

دِل کو دہلا دیتا تھا اور تصور ہی میں وسعتوں کو عبور کرتا ہوا ہزاروں دیہاتوں
کی سیر کر آتا جہاں ایسی ہی موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ساری دنیا
کے عالم میں ہوتی تھی۔ یہ کُہر آلود خاموشی میری رُوح کو ایک گرم لحاف میں
لیتی تھی۔ غنودگی کی حالت میں مجھ پر خوف سا طاری ہوجاتا اور میں سوچ
پڑجاتا کہ اس بے پایاں کائنات میں میرا وجود کتنا بے حقیقت ہے۔

دیہات کی زندگی میری نظر میں بے رنگ اور بے معنی تھی۔ پہلے میں
سُنا کرتا تھا کہ دیہاتیوں کی زندگی فطرت اور صحت کے قریب ہوتی ہے۔ لیکن
کسانوں کو میں نے جہالت، ان تھک محنت اور غلاظت کے بار سے دبا
پایا۔ ان میں سے کسی کو مسرت کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ شہر کے مزدوروں
زندگی بھی اتنی ہی سخت تھی۔ لیکن انھیں کسی حد تک اطمینان میسر تھا
وہ ان بے ذوق انسانوں کی طرح ہمیشہ زمانے کی شکایت نہیں کیا کرتے
تھے۔ کسان کی ساری توجہ زمین پر تھی اور حالات کا تقاضا تھا کہ وہ دوسر
سے چوکس رہے۔ چناں چہ اس کی زندگی میں معصومیت کا شائبہ بھی نہ
اسے ذہانت یا اخلاص سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ گاؤں کے لوگوں کی مثال
ان اندھوں کی تھی جو ٹٹول ٹٹول کر چل رہے ہوں اور ایک دوسرے سے
ہوں کہ اس کے پیروں تلے کچل نہ جائیں۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ خوخول، پن کوف اور ان کے دوستوں
سے نفرت کیوں کرتے ہیں جن کا گناہ بس یہی تھا کہ وہ پاک صاف زندگی
کرنا چاہتے تھے۔

شہری زندگی کے فوائد گنانے کی ضرورت نہ تھی جہاں مسرت کی تلاش
اور علم کا تجسس عام تھا اور جہاں کے مسائل ایک نہیں ہزار تھے۔ ایسے

تھوں پر مجھے دو شہری گھڑی سازوں کی دُکان کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ اس
ں دو کھڑکیاں تھیں جن کے سامنے میز بچھا کر دونوں مستری مختلف اوزاروں
گھڑیوں کو اُلٹتے پلٹتے رہتے تھے۔ کام کرتے کرتے اکثر ان میں سے کوئی گیت
سنانے لگتا۔ مَیں گھنٹوں ان کے کرتبوں کا تماشا دیکھتا اور رشک سے سوچتا
یہ کیسے ہوشیار لوگ ہیں جو باریک سے باریک مشینوں کا راز جانتے ہیں۔

لیکن دیہات میں میرے لیے کوئی کشش نہ تھی اور کسانوں کے دماغ
تھاہ پانا ناممکن تھا۔ ان کی عورتیں سدا روگی تھیں۔ کسی کے پیٹ میں درد
کسی کی آنکھوں میں دُکھ ہے یا کسی کے سر پر جِن سوار ہے۔ فرصت کے وقت
ب وہ گھر کی چوکھٹ پر یا ندی کے کنارے مِل بیٹھتیں تو انھی بیماریوں کا
کیا کرتیں۔ بات بات پر وہ جھگڑنے اور گالیاں بکنے لگتی تھیں۔ ایک مرتبہ
ی کی ہانڈی ٹوٹ جانے پر تین گھرانوں میں وہ مارپیٹ ہوئی کہ ایک بڑھیا
تھ ٹوٹ گیا اور ایک لڑکے کا سر پھوٹ گیا۔ اس قسم کی جوتی پیزار اکثر
کرتی تھی۔

لڑکیوں سے لڑکے بُری طرح پیش آتے تھے۔ کھُلے میدان میں انھیں
لڑکے ان کے لہنگے اُلٹ کر سر پر باندھ دیتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ یہ لڑکیوں
ول بنانے' کا کھیل ہے۔

ننگی ہو جانے کے بعد لڑکیاں اپنی چیخ پکار سے آسمان سر پر اُٹھا لیتی
ں۔ لیکن شاید یہ کھیل دِل ہی دِل میں انھیں مرغوب تھا کیوں کہ دوبارہ
پہننے میں وہ جان بوجھ کر دیر کرتی تھیں۔ گرجا گھر میں لڑکے ان کی ران
پکے چپکے سہلایا کرتے تھے اور شاید اِسی تفریح کی خاطر گرجا گھر جانے کی
ت کرتے تھے۔ اتوار کو پادری انھیں ڈانٹا کرتا تھا کہ 'خبیثو، کیا تمھیں

اس بے حیائی کے لیے اور کوئی جگہ نہیں ملتی۔

خوکول کا کہنا تھا کہ: "یوکرین والے مذہب کو بھی ایک قسم کی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں خدا کے نام پر وہ نفس پرستی اور ذلالت روا رکھی ہے کہ توبہ۔ انھیں نہ خدا کی عظمت پر ایمان ہے نہ اس کے قہر کی پروا۔ ایک طرح یہ اچھا ہی ہے کیوں کہ مذہب کے بندھن کو یہ آسانی سے توڑ سکیں گے۔ میری بات یاد رکھو کہ مذہب انسان کی ترقی کی راہ میں زہرِ ہلاہل ہے۔"

گانو کے لونڈے تھے تو بڑبولے لیکن پرلے درجے کے ڈرپوک۔ تین مرتبہ انھوں نے راستہ روک کر اندھیرے میں مجھ پر وار کیا لیکن ناکام رہے۔ آخری بار کسی کا ڈنڈا میری ٹانگ پر لگ گیا۔

مَیں نے خوکول سے اس واردات کا ذِکر نہیں کیا۔ مگر مجھے لنگڑاتے دیکھ کر وہ اصل ماجرا سمجھ گیا اور بولا: "اچھا، تمھیں بھی انعام مِل گیا۔ مَیں تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔"

وہ مجھے رات کی سیر سے منع کیا کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی مَیں ندی کے کنارے ہریالی پر جا بیٹھنے سے اپنے کو نہ روک سکتا تھا۔ بید مجنوں کے جھرمٹ میں لیٹے لیٹے مَیں ندی پار کے مرغزاروں کو تاکا کرتا تھا۔ دولگا کی رواں دواں موجیں مدّھم چاندنی میں عجیب لُطف پیدا کرتی تھیں۔ مجھے چاند سے نفرت تھی، کیوں کہ اس میں کچھ ایسی اداسی تھی جو مجھ میں کتّے کی طرح دُکھ کے مارے چیخ اُٹھنے کی خواہش پیدا کرتی تھی۔

جب یہ معلوم ہوا کہ چاند بے جان ہے بلکہ اپنا نور بھی سورج سے اُدھار لیتا ہے تو مجھے دِلی خوشی ہوئی۔ پہلے میرا قیاس تھا کہ چاند میں دھات کے بنے ہوئے جان دار بستے ہیں جو چلتے وقت فضا کو ٹھن ٹھنا ٹھن کی صدا

سے لرزا دیتے ہیں۔ میرے تصوّر میں وہاں کے پیڑ پودے بھی دھات کے بنے ہوئے تھے اور ان کی سرسراہٹ ہمیشہ جھنک اور کھنک پیدا کرتی تھی۔ میں یہ بھی سوچتا تھا کہ چاند کی دُنیا کی ہر شے دنیا کی مخالف اور اس کی بربادی کے درپے ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ چاند کی حیثیت ایک سنسان ریگستان سے زیادہ نہیں۔ تاہم میں دُعا کرتا کہ کوئی ستارہ اس پر اس طرح ٹوٹے کہ وہ پاش پاش ہوکر زمین پر گر پڑے۔

جب میں دیکھتا کہ دریا چاند کی کرنوں کو موجوں پہ نچاتا ہوا تاریکی کی چادر کو پھاڑ کر افق کے پاس اپنے جلوے کو اُجاگر کر کے حدِ نظر سے غائب ہوجاتا ہے تو معلوم نہیں کیوں میرے خیالات میں دلیری اور گہرائی پیدا ہوجاتی تھی۔ اب ان چیزوں پر غور کرنے میں آسانی ہوتی تھی، جو روزمرّہ کی زندگی سے مختلف تھیں۔ یہ دریا اتنا گہرا تھا کہ اسے شور و فغاں کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ کبھی کبھار کوئی اگن بوٹ کسی آتشین پرندے کی طرح اپنے پنکھوں کو پھڑپھڑاتا ہوا دریا کے سینے میں ذرا دیر کے لیے تلاطم برپا کر کے غائب ہوجاتا تھا۔ دوسرے کنارے پر ایک چھوٹا سا چراغ جلا کرتا تھا جو پانی پر جلتے ہوئے خون کی سیدھی لکیر کھینچ دیتا تھا۔ دراصل یہ کسی ماہی گیر کا چراغ تھا جو رات کے وقت مچھلی کا شکار کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ گمان بھی ہوسکتا تھا کہ کوئی آوارہ ستارہ آسمان سے دریا میں گر پڑا ہے اور موجیں اُسے کوئی جنگلی پھول سمجھ کر مرغزار کی طرف بہائے لیے جارہی ہیں۔

کتابوں کا علم انسان کے دماغ میں تصوّر کا تانا بانا بُنا کرتا ہے اور خیالی حُسن کے ایسے جادو اثر پیکر لا کھڑا کرتا ہے گویا کوئی رات کی مہکتی ہواؤں میں ندی کی لہروں پر تیر رہا ہو۔

عزّت نے مجھے ندی کنارے ڈھونڈ نکالا۔ میرے پاس بیٹھتے
وہ بولا: "تم پھر ادھر ہی آ نکلے؟" دیر تک وہ بیکتے کے عالم میں در
آسمان کو تاکتا اور اس اثنا میں اپنی خوب صورت سنہری ڈاڑھی کو سہلاتا
پھر خوابیدہ آواز میں کہنے لگا: "میں ہر قسم کا علم حاصل کروں گا۔ دور دور
جنگل پہاڑوں کی سیر کروں گا۔ اور میں دوسروں کو اپنا علم سکھاؤں گا۔ تم
سے کیا کہوں کہ دل کا حال دوسروں کو سنانے سے کتنی تسکین ہوتی ہے
ہم دردی ظاہر کرو تو بعض عورتیں بھی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں
ایک رات کا ذکر ہے کہ میری ڈونگی میں بیٹھے بیٹھے ایک عورت کہنے لگی کہ
مرنے کے بعد کیا ہوگا کیوں کہ مجھے تو جنّت دوزخ پر ایمان نہیں ——
تم نے عورتوں میں بھی روح ہوتی ہے۔"

عزّت دن کی بہ نسبت رات کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ وہ حُسن کا ر
تھا اور اس کا ذکر طفلانہ معصومیت سے کیا کرتا تھا۔ اس کے تصور میں
ایک قوی وحسین بوڑھا تھا جو ارادتاً تو رحیم و کریم تھا لیکن بدی کو اس
فنا نہ کرسکتا تھا کہ آبادی کی کثرت کی وجہ سے ہر شے کا حساب رکھنا اس
بس کا روگ نہ تھا۔ پھر بھی عزّت کو امید تھی کہ کبھی نہ کبھی اللہ میاں
کھاتا بھی صحیح کرلیں گے۔ "لیکن عیسیٰ کا معمّا مجھ سے حل نہیں ہو سکا
یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ خدا واحد ہے لیکن کوئی اس کا شریک کیوں
جب خدا زندہ سلامت موجود ہے تو اسے ایک بیٹے اور وارث کی ضر
کیوں ہوئی؟"

عموماً عزّت اپنے خیالات کی دنیا میں گم سم رہتا تھا۔ اور بات
کا جواب ہاں، نا یا کسی اکھڑے ہوئے جملے سے دے کر چپ ہو جاتا

دریا کا پانی کسی اژدہے کی طرح کسمساتا بل کھاتا بہا چلا جاتا تھا اور آسمان پر کہکشاں کی روپہلی موج جھلکتی رہتی تھی۔ ستاروں پر زرّیں مرغوں کا گمان ہوتا تھا۔ اور اس نظارے سے مسحور ہو کر میرا دل رموزِ حیات کے متعلق اپنی موشگافیوں میں منہمک ہو جاتا تھا۔

کبھی یہ تماشا بھی دیکھا کہ گلابی بادلوں کے جھروکے سے سورج نے منھ نکالا اور اس کی کرنیں مور پنکھ کی طرح آسمان پر بکھر گئیں۔ عزّت مسرّت سے نہال ہو گیا اور پکار اٹھا کہ 'سورج بھی کیسی عجیب چیز ہے' سیب کے پیڑوں میں پھول آ رہے تھے اور ان کی مہک نے دیہات کی مختلف بدبوؤں کو دبا دیا تھا۔ دیہات سے لے کر کھیتوں تک سیکڑوں پیڑ پھولوں کی قبا پہنے دلھن بنے کھڑے ہوئے تھے۔ چاندنی راتوں میں پھولوں کی کلیاں اس طرح چٹختیں گویا زیرِ لب گنگنا رہی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ گانو پر نیلے سنہرے بادل امنڈ آئے ہیں۔ رات بھر پھولوں کو گلے لگا کر بلبلیں گیت گایا کرتیں اور دن کو سیب کی ڈالیوں پر غزل خواں پرندوں کا میلا لگا رہتا۔

تیوہار کے دن کنواریاں اور دلھنیں شام کے وقت گلی کوچوں میں اٹھلاتی گاتی پھرا کرتی تھیں۔ ان کے منھ ننھے پرندوں کی چونچ کی طرح کھلے ہوتے اور ان پر احمقانہ تبسم ہوتا۔ ایسے موقع پر عزّت متوالوں کی طرح مسکرانے لگتا تھا۔ اس کا جسم سکڑ جاتا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ جاتے اور چہرا زیادہ حسین و معصوم ہو جاتا۔ دن بھر سو کر تیوہار کی شام کو وہ باہر آتا اور اس کے چہرے پر وحشت کے آثار ہوتے۔ گلکش کن اس کی حالت دیکھ کر ہنس پڑتا لیکن عزّت شرما کر کہتا: "چپ رہو، مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں ہے۔"

پھر وہ مستی سے پکار اٹھتا: "زندگی کتنی سہانی ہے۔ دل کی داستان

کس قدر دل چسپ ہی۔ عمر بھر یہ افسانہ یاد رہتا ہی اور قیامت کے دن جب مُردے زندہ ہوں گے تو بھی انھیں یہی افسانہ یاد رہے گا۔"

خوکول نرمی سے اسے سمجھاتا کہ "زیادہ پر نہ کھولو ورنہ میاؤں کی امت تمھاری گوش مالی کردے گی۔"

عزّت کو بھی اس رائے سے اتّفاق تھا: "اگر وہ ایسا کریں تو بے جا نہ ہوگا۔"

ہر رات کو باغوں اور کھیتوں سے بُلبُلوں کے ترانوں کے ساتھ تمگن کا دل دوز نغمہ بلند ہوتا۔ اس کے گیتوں میں اتنا رس ہوتا کہ کسان اس کے بہت سے گناہ معاف کردیتے تھے۔

سینیچر کی شام کو ہماری دُکان پر گانو والوں کی بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ وہ سب دیر تک بیٹھے مختلف مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ آنے جانے کا سلسلہ آدھی رات تک جاری رہتا تھا۔ ان میں سب سے بڑا فسادی ایک کانا سپاہی 'کوستن' نامی تھا جس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں غائب تھیں۔ وہ آستین چڑھائے گھونسا دکھاتے پالی کے مُرغ کی طرح پینترا بدلتے ہوئے دُکان میں داخل ہوتا اور پھٹی ہوئی آواز میں چیخ کر کہتا:

"خوکول! تم عیسائی نہیں مسلمان ہو۔ یہ تو کہو کہ گرجا گھر کیوں نہیں جاتے۔ تم کافر ہی نہیں بلکہ باغی بھی ہو۔"

سب لوگ اسے چھیڑتے: "ہو نہ ہو تمھاری انگلیاں دیمک نے چرلی تھیں ——— اور تم ترکوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟"

کانا سپاہی ہمیشہ لڑائی کے لیے تیار رہتا تھا لیکن لوگ ڈنڈا ڈولی کر کے اسے کھائی میں پھینک دیتے تھے۔ اور جب وہ ڈھلان پر قلابازیاں کھانے

لگتا تو گلا پھاڑ کر چیختا : " بچاؤ ، دوڑو ، میرا خون ہو رہا ہے۔"
کچھ دیر بعد کوستن کپڑے جھاڑتے ہوئے کھائی سے برآمد ہوتا اور خوکول سے ایک گھونٹ شراب کی فرمائش کرتا۔
" یہ کس لیے ؟ "
" ہنسی مذاق کا انعام بھی نہ دو گے " اس سادہ جواب پر سب ہنس پڑتے تھے۔ ایک دن صبح کھانا پکانے والی تنور میں آگ سلگا کر باہر نکل گئی تھوڑی دیر بعد باورچی خانے میں دھماکا ہوا، در و دالان لرز گئے اور دُکان کے ڈبے اور پیپے اِدھر اُدھر گر پڑے۔ میں باورچی خانے کی طرف لپکا تو وہاں دھوئیں کے بادل امنڈے ہوئے تھے۔
خوکول نے شانہ پکڑ کر مجھے دھکیل دیا اور کھانا پکانے والی چلّانے لگی خوکول دھوئیں کے اندر گھس پڑا اور پکارا " پانی لاؤ۔"
فرش پر لکڑی کی چھپٹیاں مشعلوں کی طرح جل رہی تھیں اور ہر طرف اینٹ کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ تنور کا ڈھانچا غائب ہو گیا تھا۔ میں بالٹی کا پانی آگ پر چھڑکنے لگا اور لکڑیوں کو تنور کے اندر پھینکنے لگا۔ بڑی بی کو ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے جاتے ہوئے خوکول نے ہدایت کی
" ہاتھ پاؤں بچا کر، میکسم! دُکان کا دروازہ بند کر دو —— کہیں پھر کوئی چیز پھٹ نہ جائے۔" فرش پر بیٹھ کر وہ غور سے چھپٹیوں کو دیکھنے لگا۔
" کیا کرنے لگ گئے ؟ "
" یہاں آؤ ، دیکھو۔"
اس نے مجھے ایک چھپٹی دکھلائی جو بیچ سے پھٹ گئی تھی۔ اس میں سے سوراخ کیا ہوا تھا اور وہ اندر سے بالکل کالی ہو رہی تھی۔ " کچھ سمجھے، کم بخت

نے ان کے اندر بارود بھردی تھی۔ خوکول نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا: "وہ تو خیر ہوئی کہ بڑھیا یہاں نہیں تھی ورنہ اسے چوٹ لگ جاتی۔"

رفتہ رفتہ دھنواں صاف ہوگیا۔ تو ہم نے دیکھا کہ سارے برتن ٹوٹ گئے ہیں اور کھڑکیوں کے شیشے چور چور ہوگئے ہیں۔

مجھے خوکول کی یہ متانت پسند نہ آئی۔ سڑک پر تو 'آگ آگ' کا کہرام مچا ہوا تھا اور لوگوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ لیکن خوکول کی بے نیازی کا یہ حال تھا گویا یہ سازش کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔

کوئی عورت باہر ہائے وائے کر رہی تھی۔ اور ہماری ماما لگاتار چلا رہی تھی کہ "ارے یہ موے تو اندر گھسے جا رہے ہیں۔"

لیکن خوکول تولیے سے گیلی ڈاڑھی کو صاف کرتے ہوئے یہی کہے جاتا تھا کہ "چپ بھی رہو۔"

کھڑکی میں سے کئی بپھرے ہوئے چہرے جن کی آنکھیں دھنوئیں سے سُرخ ہو رہی تھیں اندر گھورنے لگیں۔ اور ان میں سے کسی نے کڑک کر کہا: "انھیں گانو سے نکال دینا چاہیے۔"

"روز کوئی نہ کوئی نئی گڑبڑ کرتے رہتے ہیں۔ دیکھو آج کیا گل کھلایا ہے۔"

ایک سُرخ ریش کسان نے صلیب کا نشان بنا کر کھڑکی کے راستے اندر گھسنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ہنسیا تھا اور بائیں سے وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر زور ڈال رہا تھا۔

خوکول نے للکارا: "کہاں گھسے آرہے ہو؟"

"آگ بجھانے کے لیے ـــ"

"یہاں کہیں آگ نہیں ہے۔"

کسان گھبرا کر پیچھے بھاگ گیا مگر خوکول دُکان کی سیڑھیوں سے نیچے
اور بارُود کی چھپٹی تماشائیوں کو دِکھا کر بولا ۔ " تم میں سے کسی نے اس کے
بارُود بھر دی تھی ۔ لیکن مقدار اتنی کم تھی کہ کوئی نقصان نہ ہوسکا ۔"
وہ لال مُنھا کسان سب سے کہ رہا تھا : " مجھے اسی چھپٹی سے مار
کی دھمکی دے رہا تھا ۔"
اُدھر وہ کانا کوستن جو شراب کے نشے میں متوالا ہو رہا تھا، پکار
" کافر کا منھ کالا ! اسے حراست میں لے لو ۔ ۔ ۔ ۔ "
لیکن اور سب چُپ چاپ خوکول کی باتوں کو مشتبہ انداز سے سن ر
" مکان کو اُڑانے کے لیے کم از کم آدھ من بارُود کی ضرورت ہی ——
تمھاری اوندھی کھوپڑی یہ نہیں سمجھ سکتی ۔ چلو، ہٹو یہاں سے ۔"
" چوکی دار کو بُلاؤ —— پولیس کا جمع دار کہاں ہی ۔"
ایک ایک کرکے سب گنوار اس قسم کے نعرے لگاتے ہوئے چلے
آج گھر کی ملازمہ کے مزاج بھی درست ہو گئے تھے اور چائے پلا
وقت وہ میٹھی میٹھی باتیں سُنا رہی تھی : " آپ ان لوگوں کو سزا نہیں دیتے
لیے ان کے مزاج خراب ہو گئے ہیں ۔"
مَیں نے پوچھا : اب بھی آپ کو ان پر غصّہ نہیں آتا ؟ "
" بھئی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیا غصّہ کیا جائے ۔"
اس کے فوراً بعد وہ کہنے لگا کہ قازان جاکر کچھ کتابیں لانا ہی ۔
گاہے گاہے مجھے محسوس ہوتا کہ خوکول انسان نہیں بلکہ مشین کا پُرزہ
جو ایک بار کوک بھر دینے کے بعد ہمیشہ حرکت میں رہتا ہی ۔ میرے دِل میں
کی بڑی عزت تھی لیکن اکثر یہ خواہش ہوتی کہ کبھی وہ مجھ پر یا اور کسی پر خفا

سینے میں جذبات کی موجودگی کا ثبوت دے۔ مگر نہ اسے غصہ آتا تھا نہ آسکتا تھا۔ کسی کی حماقت یا ذلالت کا اس پر اتنا سا اثر ہوتا کہ بھنویں تن جاتیں آنکھوں میں حقارت چمک اُٹھتی اور وہ ایک آدھ سیدھے سادے جُملے میں کوئی پھبتی کس کر خاموش ہو جاتا۔

مثلاً سس لوف سے اس نے ایک مرتبہ کہا: "تُم جیسے بوڑھے پھُونس کو ضمیر کُشی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

یہ سُن کر بوڑھے کا زرد چہرہ تمتما اٹھا، یہاں تک کہ ڈاڑھی کے بالوں پر بھی گلابی رنگت چھا گئی۔

"ایسی باتوں سے تمھیں تو کچھ حاصل نہیں ہوتا، اُلٹے دوسرے کی نظر میں گر جاتے ہو۔"

سس لوف نے بھی سر کے اشارے سے اِس حقیقت کا اعتراف کیا۔ بعد میں اس نے عزّت سے کہا: "اگر ایسے آدمی حاکم بنا دیے جائیں تو دُنیا کی حالت سُدھر جائے۔"

چلتے وقت خوکول نے چند الفاظ میں مجھے سمجھایا کہ اس کی غیر حاضری میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ بارُود کی سازش کو وہ اس طرح بھوُل گیا تھا گویا یہ توجہ کے قابل ہی نہ تھی۔

پن کوف نے تنور کا معائنہ کرکے پوُچھا: "تم ڈر تو نہیں گئے؟"

"ڈر ــــ کس بات کا ڈر؟"

"اسے جنگ کا اعلان سمجھو۔"

رخصت کے وقت بھی پن کوف نے تردّد سے یہی الفاظ دُہرائے۔ وہ خوکول سے اس قدر اختصار برتتا گویا دونوں میں گفتگو کے تمام

موضوع ختم ہو چکے ہیں ۔ جب خوکول نے بے رحم زار آئیوں کا قصہ
تو عزّت نے " احمق " اور گکش کن نے " جلاد " کے القاب دے کر یہ
ختم کردی ۔ پن کوف نے یہ قطعی رائے دی :" اس زار کی کھوپڑی میں
بھرا ہوگا ورنہ سارے جاگیرداروں کو مار کر اُن کی زمینیں ادنا منصب د
یں بانٹنے کی کیا ضرورت تھی ۔ اور پردیسیوں کو لاکر روس میں بسانے
کیا مصلحت تھی ۔ سب جانتے ہیں کہ بڑے جاگیردار کی بہ نسبت چھ
کہیں زیادہ بے کار ہوتا ہے ۔ بھیڑیے سے زیادہ تکلیف مکھی دیتی ہی
تنور کو چونے گارے سے ٹھیک ٹھاک کرتے ہوئے گکش ک
لگا :" بدبختوں نے کیسی سازش کی تھی ۔ اپنے جسم کے پسّو تو ان
مرتے نہیں لیکن انسانوں کو مار کر انھیں دِلی خوشی ہوتی ہے ۔ بھ
خوکول ، آیندہ تم زیادہ سامان دُکان میں جمع نہ کیا کرو ورنہ یہ مک
آگ لگانے سے نہ چوکیں گے ۔ تم نے تنظیم کا جو روگ پھیلایا ہے اس ک
نتیجہ ہونے والا تھا ۔"

اپنے ساتھیوں کی مدد سے خوکول نے غریب کسانوں کی تنظیم
کردی تھی جس کی وجہ سے گانو کے امیر زمین دار اس کی جان کے
ہو گئے تھے لیکن عوام اس کا دم بھرنے لگے تھے اور دُکان کے گا
کی تعداد بڑھتی جاتی تھی ۔ اور تو اور مگن جیسا نکھٹو بھی اب ہمارا
معین بن گیا تھا ۔

مگن کی صحبت میں بڑا سُکھ ملتا تھا اُس کے حسین اور اُدا
مجھے بہت پسند تھے ۔ گاتے وقت اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں ا
کی مستقل اینٹھن بھی گھڑی بھر کے لیے غائب ہو جاتی ۔ بدلی بھری

راتوں میں اس کے مردہ جسم میں نئی جان پڑ جاتی تھی۔ شام کے وقت اس کی پکار سنائی دیتی کہ: "ہے کوئی ندی چلنے والا؟"

اپنی ڈونگی پر وہ پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ میں روہو مچھلی پکڑنے کی بنسی تھی جس کا شکار ممنوع تھا۔ اور آہستہ سے بولا:

"مالک مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ میں دل کو سمجھا لیتا ہوں کہ وہ مجھ سے زیادہ ہوشیار ہے۔ لیکن جب مجھ جیسا کوئی کسان دھونس جماتا ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ ہم میں اس کے سوا کیا فرق ہے کہ اس کے پاس چاندی ہے تو میرے پاس تانبا ہے۔"

مگن کا چہرہ ڈراونا تھا۔ اس کی بھنویں تھرکتی رہتی تھیں اور جب وہ بنسی کی ڈوری کو سلجھاتا تو انگلیاں آپ ہی آپ ناچنے لگتی تھیں۔ ایک مخلصانہ انداز میں اس نے اعتراف کیا: "اپنے چور ہونے سے مجھے انکار نہیں لیکن یہ تو کہو کہ چور کون نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کا خون چوستے رہتے ہیں۔ جب خدا ہم سے بے نیاز ہے تو ہم لامحالہ شیطان کی نیازمندی کرنے لگیں گے۔"

ندی کا کالا پانی ہمارے دائیں بائیں بہتا چلا جاتا تھا۔ اوپر کالے بادل اُڑ رہے تھے اور اندھیرے کی وجہ سے ساحل بھی آنکھ اوجھل ہو گیا تھا۔ موجیں دھیرے سے کنارے سے ٹکرا کر میرے پیروں پر یوں لوٹنے لگتیں گویا مجھے اس عمیق تاریکی میں گم ہو جانے کی دعوت دے رہی ہوں۔

مگن نے ایک آہ بھر کر کہا: "زندگی کا کیا حاصل؟"

کسی پہاڑی پر ایک کتا رو رہا تھا اور میں گویا خواب میں سوچنے لگا۔ "یہ بھی کوئی جینے میں جینا ہے۔"

دریا میں خاموشی، تاریکی اور اُداسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگن آپ ہی آپ کہنے لگا: "افسوس کہ وہ لوگ خوکول کے ساتھ تمھیں بھی مار ڈالیں گے۔" پھر وہ میٹھے سُروں میں گنگنانے لگا۔

ندیا نالے گنوا آئی کنگنا

مگن کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں اور اس کی آواز غم میں سموئی ہوئی تھی۔ میرے بدن میں ایسی سنسنی دوڑ گئی گویا پانی کے بوجھ سے زمین بیٹھی جارہی ہے اور پاتال میں دھنسی جارہی ہے۔ یہ محسوس ہوا کہ میں یہ دُنیا چھوڑ کر تاریکی میں تحلیل ہورہا ہوں —— ایسی تاریکی جو سورج سے قطعاً ناآشنا ہے۔

یہ دِل دوز نغمہ اچانک ختم ہوگیا اور مگن کشتی لے کر منجدھار میں غائب ہوگیا۔

میرا دُوسرا دوست 'بری نوف' نامی تھا۔ یہ بھی ایک کاہل الوجود آوارہ مزاج تھا۔ وہ ماسکو کا رہنے والا تھا اور جب دیکھو اسی شہر کی باتیں سُناتا رہتا تھا: "بڑا غدّار شہر ہے۔ کم نہ زیادہ پورے چودہ ہزار گرجا گھر ہیں۔ قسم کھانے کو جو کہیں ایک بھی ایمان دار آدمی مل جائے۔ گھوڑے خچروں سے بھی گئے گزرے۔ جسے دیکھو داد یا کھجلی میں مبتلا۔ وہاں جو 'شاہ توپ' رکھی ہے اس کی ہیبت بیان سے باہر ہے۔ پیٹرِ اعظم نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے اپنے ہاتھ سے یہ توپ ڈھالی تھی۔ کسی نواب زادی نے یہ بغاوت شروع کی تھی۔ اصل میں زار نے سات سال اسے حرم میں رکھا بلکہ تین بچّے بھی عطا کیے اور پھر نکال دیا۔ اس نے غصّے میں آکر بغاوت کرادی۔ زار نے جب یہ توپ داغی تو نو ہزار باغی جل بھُن کر راکھ ہوگئے۔ زار یہ دیکھ کر گھبرا گیا اور حُکم دیا کہ اس توپ کو زمین میں گاڑ دو۔"

جب مَیں نے اس قصّے کو بے بنیاد بتایا تو بری نوف غصّے سے چلّا پڑ
"تم سیاہ قلب ہو ورنہ میری ہر بات پر ایمان لاتے۔"

کبھی کبھی وہ اولیا کے مزار کی زیارت کے لیے "کیف" پر دھاوا کر
اور کہتا: "یہ شہر پہاڑی پر بسا ہوا ہے۔ کنارے کوئی ندی بہتی ہے، جو ہمار
دولگا کے مقابلے میں گندی موری کی حیثیت رکھتی ہے۔ عجیب بے ڈھنگا شہر
کہ جس سڑک کو دیکھیے نیچے سے اوپر چڑھی چلی جاتی ہے۔ وہاں روسیوں کے عل
سب قوموں کے لوگ رہتے ہیں۔ وہ بات نہیں کرتے کاٹنے دوڑتے ہیں
ان کا من بھاتا کھاجا بینڈک ہے جس کا وزن پانچ پانچ سیر ہوا کرتا ہے۔ کیف
کے پادریوں اور راہبوں کی تعداد ستاون ہزار دو سو سے کم نہ ہوگی۔ ۔ ۔ ۔
اب کہو میاں بجر بٹو، ان واقعات کو تم کیسے جھٹلا سکتے ہو۔ یہ سب آنکھو
دیکھا ہے۔ اور تم تو وہاں کبھی گئے بھی نہیں۔ پھر تو مَیں سچّا تم جھوٹے۔ مجھے
جھوٹ سے نفرت ہے ——"

اعداد و شمار سے اُسے محبّت تھی۔ مَیں نے اسے جمع اور ضرب کا طریقہ
تو سکھلا دیا لیکن تقسیم کے سوال اسے ناپسند تھے۔ ضرب کے مشکل سوال وہ
ریت پر حل کرنے بیٹھ جاتا اور غلطیوں کی پروا نہ کرکے لمبے چوڑے اعداد
اُنگلی سے گھسیٹنے لگتا۔ پھر حیرت سے انھیں پڑھ کر وہ طفلانہ سادہ لوحی سے
پکار اُٹھتا:

"کسی کے ذہن میں بھی اتنے بڑے عدد نہ آئے ہوں گے۔"

یوں تو وہ بے ڈول اور گندہ تھا لیکن نیلی آنکھوں کے معصوم تبسّم اور
گھونگھر دار ڈاڑھی نے چہرے کو رونق بخش دی تھی۔ بری نوف اور کگش کن میں
کئی باتیں ملتی ہوئی تھیں اور شاید اسی لیے دونوں ایک دوسرے سے کتراتے

تھے۔

بری نوف دو مرتبہ کاسپین (بحیرۂ خضر) میں مچھلی کا شکار کرچکا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا کہ: "دنیا کا کوئی سمندر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ میاں اس کی وسعت ایسی بے کراں ہو کہ دیکھ کر ہوش غائب ہوجاتے ہیں۔ اور وہاں کی راتیں اور دِن بڑے سہانے ہیں۔ بھانت بھانت کے انسان اس کے اِرد گرد جمع ہوتے ہیں۔ کسی سرکاری وکیل کی داشتہ ایک ملازمہ تھی وہ کہنے لگی کہ مَیں تم پر فدا ہوں لیکن کیا کروں کہ جُدا ہونا پڑتا ہو۔ وجہ یہ ہو کہ جس نے اس سمندر کو ایک بار دیکھ لیا گھوم پھر کر دوبارہ اسے دیکھنے آئے گا۔ وہ آسمان کی طرح وسیع ہو اور وہاں تنہائی ہی تنہائی ہو۔ مجھے بھی انسانوں سے نفرت ہو اس لیے جاکر اسی کے کنارے عمر گزار دوں گا۔ اگر ریگستان میں آشرم مِل جائے تو مَیں سادھو بن کر رہنے لگوں۔ مگر یہ تو کہو کہ کسی آشرم میں شریف بھی رہ سکتے ہیں۔"

گانو میں وہ لنڈورے کتّے کی طرح پھرا کرتا تھا۔ اور گو دیہاتی اسے حقیر سمجھتے تھے لیکن اس کے قصّے ویسی ہی دِل چسپی سے سُنتے تھے جیسے مگن کے گیت۔ بعد میں ان کی رائے ہوتی کہ "یہ ہو تو جھوٹا لیکن اس کی باتیں لُطف سے خالی نہیں۔"

اس کی غپ بازی اکثر پن کوف جیسے سنجیدہ مزاج کو بھی چکّر میں ڈال دیتی تھی۔ چناں چہ ایک دِن وہ خوکول سے کہنے لگا: "بری نوف کا خیال ہو کہ زار آیوِن کے پُورے حالات قلم بند نہیں کیے گئے ہیں۔ وہ جادُو کے زور سے عقاب بن سکتا تھا اسی لیے اس کے سکوں پر عقاب کا نقش بنایا جاتا تھا۔"

مَیں نے غور کیا کہ غیر دِل چسپ خیالی افسانوں کو لوگ حقیقی زندگی کے دِل چسپ واقعات پر ترجیح دیتے تھے۔ جب مَیں نے خوکول سے یہ بات کہی

تو اس نے مُسکرا کر جواب دیا: "یہ سچ ہی لیکن انسانوں کی ذہنیت میں تبد
ہوتی ہی۔ وہ سوچنے کے قابل ہوجائیں تو حقیقت کو سمجھنے لگیں گے۔ تمھ
بری نوف اور گلش کن کی اصلیت کو پہچاننا چاہیے۔ اسی خمیر سے فن کار
مصنف پیدا ہوتے ہیں۔عیسیٰؑ بھی اسی قبیل کا آدمی تھا اور ماننے کی بات
کہ اس کے خیالات کا ایک حصّہ حُسن سے خالی نہیں۔"

یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ یہ سب لوگ خدا کا نام کبھی نہ لیتے تھ
صرف بوڑھا سس لوف مجاہدانہ انداز میں یہ صدا لگاتا کہ:

"یہ کائنات خدا کی تخلیق ہی۔"

کسانوں سے میرے تعلقات بُرے نہ تھے اور رات کی بیٹھک میں
کی گفتگو سے میں بہت کچھ سیکھا کرتا تھا۔ خوکول جو سوال پوچھتا وہ ایک بیج
طرح ہوتا جو تناور درخت کی طرح بڑھتا جاتا اور اس میں خیالات کی ڈالیاں
شیریں الفاظ کی پتّیاں لگتی جاتی تھیں۔

کتابوں کے مطالعے سے میرے دماغ کی نشو ونما ہونے لگی اور اب
کچھ کہتے ہوئے پہلے کی سی جھجھک نہ ہوتی تھی۔ خوکول بھی کئی بار میری تعریف
تھا: "میکسم تمھاری اُٹھان زوروں پر ہی" یہ الفاظ سُن کر میرا سینہ احسان
معمور ہوجاتا تھا۔

پن کوف کے ساتھ کبھی کبھی اس کی بیوی بھی آتی تھی۔ وہ شہری بیگمو
لباس زیبِ تن کرتی تھی اور اس کے چہرے پر ہم دردی اور آنکھوں میں دانائ
کے آثار تھے۔ وہ کونے میں بیٹھ کر خاموشی سے دوسروں کی باتیں سُنتی اور بیچ
بیچ میں اس کا منھ حیرت سے کھُل جاتا اور آنکھیں خوف کے مارے چمک اُٹھتیں
اگر کبھی وہ سمجھ کی کوئی بات کہہ جاتی تو خود ہی شرما کر ہتیلی سے منھ چھپالیتی۔ اور پن ک

خوکول کو آنکھ مار کر کہتا: "یہ سب سمجھتی ہے۔"

دُور دُور سے لوگ خوکول سے ملنے آتے اور وہ انھیں لے کر میرے حجرے
یں گھنٹوں غائب رہتا تھا۔ وہ وہیں سوتے تھے اور ان کا کھانا بھی اوُپر ہی چلا
جاتا تھا۔ میرے اور ملازمہ کے سوا کسی کو ان کی موجودگی کی خبر نہ ہوتی تھی۔ اور
ملازمہ جو وفا کی پُتلی تھی خوکول کو دیوتا سمجھتی تھی۔ رات کو عزت اور پن کوف
ن مہمانوں کو کشتی میں سوار کر کے دُور کے کسی گھاٹ یا اگن بوٹ پر چھوڑ آتے
تھے۔ پہاڑی پر کھڑا ہو کر مَیں اس کشتی کو دیکھ سکتا تھا جس میں ایک مشعل
س لیے روشن کر دی جاتی تھی کہ حدِ نظر تک ہم اس کے دھیان سے غافل نہ
ہیں۔ مجھے خوشی تھی کہ اس راز کے جاننے والوں میں مَیں بھی ہوں۔

دیرن کوف کی بہن شہر سے ہماری دُکان پر آیا کرتی تھی۔ اس کی چتونوں
س اب پُرانی کشش نہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا انداز کہتا تھا کہ اسے اپنے
ن کا احساس اور اس امر کا غرور ہے کہ ایک سربلند مرد اس کا عاشق ہے۔ خوکول
س سے بھی گفتگو کا وہی پُرسکون طنز آمیز پیرایہ اختیار کرتا جو دُوسروں کے لیے
صوص تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں نرمی آجاتی اور ڈاڑھی پر ہاتھوں کی گردش
یادہ تیز ہو جاتی۔ ماریا کی آواز میں اب ایک والہانہ انداز آگیا تھا اور اس کے
تھے ہاتھوں میں ایسی بے قراری نمایاں تھی گویا وہ کوئی سہارا ڈھونڈ رہی ہو۔
برابر گُنگُناتی رہتی تھی اور اپنے مستی بھرے ہونٹوں اور گلابی گالوں کو رومال
ے ہَوا دیتی جاتی تھی۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھ میں پہلے کا سا انتشار
ا کر دیتی تھی۔ خواہ مخواہ میرے دِل میں مخالفت اور غصّے کے جذبات پیدا
نے لگتے تھے۔ اسی لیے مَیں اس کے سائے سے دُور رہنے کی کوشش
تھا۔

جولائی کے مہینے کا ذکر ہی کہ اچانک عزّت لاپتا ہوگیا۔ لوگ ک
لگے کہ وہ ندی میں ڈوب گیا۔ دو دن بعد اس افواہ کی تصدیق بھی ہوگئی۔
سے سات میل دُور ندی کے کنارے اس کی کشتی شکستہ حالت میں ملی
قیاس آرائی کرنے لگے کہ عزّت کشتی میں سو گیا تھا اور آنے جانے وا
کسی بجرے نے اندھیرے میں ٹکّر مار کر اس کے پرخچے اُڑا دیے۔ ان
خوکول شہر گیا ہوا تھا۔ شام کو گلش کن دُکان پر آیا اور غم و اندوہ کے
میں بوریوں پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد پائپ سلگاتے ہوئے اس نے پوچھا: "خوکول کب
آئے گا؟"

"یہ تو معلوم نہیں"

اپنے چہرے کو وہ زور زور سے ملنے لگا اور زیرِ لب گالیاں بک
ہوئے یوں غرّانے لگا جیسے اس کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔

"کچھ تو کہو کہ کیا بات ہی؟"

میری طرف دیکھ کر اس نے ہونٹ مسوس لیے۔ اس کی آنکھیں سُر
ہوگئی تھیں اور جبڑے کانپ رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا ماتھا ٹھ
کہ ہو نہ ہو کوئی بُری خبر لایا ہی۔ بہ مشکل تمام اس کے منھ سے یہ الفاظ نکلے

"میں مگن کے ساتھ گاڑی میں جارہا تھا۔ عزّت کی کشتی پر نظر پڑی
تو کیا دیکھا کہ اس کی پینیدی کدالی سے پھاڑ دی گئی ہی۔ کچھ سمجھے؟ اس کا
مطلب یہ ہی کہ اسے قتل کردیا گیا ہی اور کوئی بات نہیں ہوسکتی ــــ"

بولتے بولتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ رُک رُک کر قاتلوں ک
گالیاں بکنے لگا۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا کہ وہ رو رو کر غم کو ٹھنڈا کرنے کے لیے

کس قدر کش مکش کررہا تھا، کس طرح اس کا جسم غم و غصّے سے لرز رہا تھا۔ لیکن آنسو کسی طرح آنکھوں میں نہ آتے تھے۔ بالآخر وہ کانپتا ہوا باہر چلا گیا۔

دوسرے دن شام کے وقت ندی میں نہاتے ہوئے کچھ کم عمر لڑکوں کو عزّت کی لاش ملی جو ایک بجرے کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ بجرے کا آدھا حصّہ زمین پر چڑھ گیا تھا اور اس کی پیندی میں عزّت کی اوندھی لاش پھنسی ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی چکنا چور تھی اور بھیجا پانی میں بہ گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر پیچھے سے وار ہوا تھا اور کدالی کی مار سے کھوپڑی ٹوٹ گئی تھی۔ پانی کے زور سے اس کے ہاتھوں اور پیروں میں یوں جنبش ہورہی تھی گویا وہ باہر نکلنے کی جان توڑ کوشش کر رہا ہو۔

ندی کے کنارے لگ بھگ بیس امیر کسان جتھا باندھے منھ بنائے کھڑے تھے۔ غریب کسان ابھی اپنے کھیتوں سے نہ لوٹے تھے۔ گاؤں کا سرپنچ جو پرلے درجے کا مکّار اور ڈرپوک تھا ہاتھ میں ڈنڈا لیے اِدھر اُدھر پُھدک رہا تھا۔ رہ رہ کر وہ ناک سنکتا اور آستین سے آنکھ پونچھتا جاتا تھا۔

اُس کے پاس دُکان دار کزمن اپنی توند مٹکائے کھڑا تھا اور وہ کن انکھیوں سے مجھے اور کُکش کن کو دیکھتا جاتا تھا۔ اس کی بھنوّیں تنی ہوئی تھیں اور بے نور آنکھوں سے آنسو بہا رہا تھا۔

سرپنچ اپنی پُرپیچ ٹانگوں پر اُچکتے ہوئے چلّانے لگا " ہائے ہائے سفید خون ۔۔۔ لوگو! یہ کیسا غضب ہوا۔"

اس کی سالی جو جواں سال اور جوبن کی ماتی تھی ایک چٹان پر بیٹھی لہروں کو گن رہی تھی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے صلیب کا نشان بنا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ یوں کُھلے ہوئے تھے کہ کسی کُتیا کا خیال آتا تھا۔

پہاڑیوں پر لڑکیاں اور لڑکے رنگین گیندوں کی طرح لڑھک رہے تھے۔گر
غبار میں اٹے ہوئے کسان لپ جھپ آجا رہے تھے۔یوں تو سب سنا
میں تھے اور جو کوئی بولتا بھی تو آہستہ سے :

"بڑا لڑاکا تھا"

"کیا بکتے ہو تم"

"گکش کن تو جھگڑالو ہی ہے"

"لیکن عزت امن پسند تھا"

گکش کن خنزیر کی طرح کسانوں پر جھپٹ پڑا : "اب امن پسند کہتے
ــــ حرام زادو! پھر اس کا خون کس لیے کیا"

اتنے میں ایک عورت نے دیوانہ وار قہقہہ لگایا اور اس کی چیخ
ہجوم پر تازیانے کا کام کیا۔کسان مشتعل ہوکر آپس میں گتھ گئے اور گا
گلوچ کرنے لگے۔ گکش کن اس توندل دُکان دار پر جھپٹا اور پوری طاقت
اس کے ناپاک کلّوں پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔"یہ ہو تیری سزا کمینے کہیں
یہ کہہ کر گھونسا دِکھاتے ہوئے وہ بھیڑ کے اندر سے نکل آیا۔ اور ہنس کر مجھ
بولا :

"ہٹ آؤ۔ اب یہ نامعقول ایک دوسرے کا سر پھوڑیں گے"

کسی نے اس پر بھی چوٹ کردی تھی کیوں کہ اس کے نچلے ہونٹ
خون ٹپک رہا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ اطمینان سے جگمگا رہا تھا :

"دیکھا تم نے کہ میں نے کزمن کی کیسی مرمت کی"

بڑی خوف خوف سے آگے پیچھے دیکھتا ہوا ہماری طرف بھاگ آیا۔
سرپنچ گلا پھاڑ کر چلا رہا تھا۔"ہرگز نہیں۔کوئی ثابت کر دکھائے

مَیں نے کس کی طرف داری کی ہے۔"

ایسی گھمس تھی کہ سانس لینا مُشکل تھا۔ کالے بادلوں کی اوٹ میں سورج ڈوب رہا تھا اور شفق کی جھلک سے برگ و شجر پر گُلابی رنگت چھا گئی تھی۔ کہیں دُور بجلی کڑک رہی تھی۔

میری آنکھوں کے آگے عزّت کی لاش کی تصویر آگئی۔ پانی کے دھارے نے کُچلے ہوئے سر کے بالوں کو یوں تان دیا تھا کہ وہ سیدھے کھڑے ہوگئے تھے۔ میرے کانوں میں اس کے یہ بول گونجنے لگے: "ہر انسان میں بچپن کا تھوڑا۔سا عنصر باقی رہتا ہے اور صرف وہی ہمارے ایمان کو راسخ رکھ سکتا ہے۔ خوخول کی مثال لو۔ اس کا جسم لوہے کا ہے لیکن دِل بچّوں کا سا ہے۔"

چلتے چلتے کُکش کن غصّے سے بڑبڑانے لگا: "ہم سب کا یہی انجام ہونا ہے۔ خدا کی قسم، کیسی حماقت ہے۔"

دو دِن بعد رات بیتے خوخول شہر سے واپس لوٹا۔ کسی بات سے وہ بہت خوش تھا اور غیر معمولی طور پر ہنس بول رہا تھا۔ جب مَیں نے دروازہ کھولا تو اس نے میرا شانہ تھپک کر کہا:

"میکسم! تمھیں زیادہ سونا چاہیے۔"

"عزّت قتل کردیا گیا!"

"کیا ―― کیا؟ ――"

اس کے گال پر چتّت پڑگئی اور ڈاڑھی تھرانے لگی۔ وہ کمرے کے بیچ میں یوں بے حرکت کھڑا ہوگیا گویا بجلی گر پڑی ہو۔ دیر تک اس کی آنکھیں چڑھی رہیں۔ اور پھر اس نے سر ہلاکر پوچھا:

"خونی کا پتا چلا؟ لیکن ――"

کھڑکی کی منڈیر پر بیٹھ کر وہ میری زبانی سارا ماجرا سُنتا رہا اور پوچھا: پولیس کو اطلاع کی گئی ؟ "

" تھانے دار کل آیا تھا۔"

" اس نے کیا معلوم کیا ؟ " اور خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا:

" معلوم کیا خاک ہونا تھا۔"

مَیں نے بتایا کہ تھانے دار کزمن کا مہمان تھا اور اسے پیٹنے کے الزام میں گکش کن کو حوالات میں بند کرنے کا حُکم دے گیا ہے۔

" جب یہ بات ہے تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"

چائے پیتے ہوئے خوکول کہنے لگا " افسوس کہ یہ قوم اپنے بہترین افراد کا خون کردیتی ہے۔ شاید وہ ان سے ڈرتی ہے اور سوچتی ہے کہ یہ ہماری اولاد نہیں۔ جب مَیں سائبیریا میں جلاوطن تھا تو چوروں کے ایک گروہ سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ چوری کے پیشے میں کیا آرام ہے، اسے تج کیوں نہ دیں۔ جب وہ شراب کے نشے میں مخمور سوگیا تو سب نے گلا گھونٹ کر اس کا خاتمہ کردیا۔ جس چور نے مجھے یہ واقعہ سُنایا وہ اس مقتول کا بڑا مدّاح تھا۔ بعد میں اس نے تین ساتھیوں کو قتل کردیا۔ مَیں نے پُوچھا کہ بھئی اس بھلے مانس کو تُم نے کیوں مارا۔ تو جواب مِلا کہ" وہ ایمان دار تھا اور ہم گناہ گاروں کی صحبت کے قابل نہ تھا۔"

یہ کہتے ہوئے خوکول پائپ کے کش لگاتا ہوا کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اس وقت وہ سفید رنگ کی تاتاری قبا پہنے ہوئے تھا۔ غور وفکر کے عالم میں وہ کہنے لگا " کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں کہ لوگ نیک بندوں کے

خون سے اپنے ہاتھ رنگتے ہیں اور ان کے وجود سے گھبراتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے عوام کا رویہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اُنھیں فنا کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے آتے ہیں۔ اور یا کتّوں کی طرح دُم دباکر ان کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے کیوں کہ ان کے پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی صلاحیت عوام میں ایک سرے سے نایاب ہے۔

عوام میں طاقت تو ہے لیکن قوتِ ارادی نہیں ہے۔ صدیوں کی محنت سے انھوں نے زندگی کا ایک نظام قائم کیا ہے۔ اب اگر کوئی ہوش مند اس کی بُرائیاں گنائے اور اسے گِراکر کوئی بہتر نظام بنانے کی تلقین کرے تو اسے کیا جواب ملے گا۔ بس یہی نا کہ تجھ پر لعنت ہو۔ ہمارے اجداد کی روایات کو بُرا کہتا ہے۔ اس مخالفت کے باوجود حقیقت انھی کی ہم زبان ہے جو اعلان کرتے ہیں کہ زندگی کی موجودہ روش غلط ہے۔ یہی لوگ انسانیت کے پیشوا اور ارتقا کے علم بردار ہیں۔"

کتابوں کی الماری کی طرف اشارہ کرکے وہ بولا "میری مراد ان مصنفوں سے ہے۔ کاش میں بھی ایسی ہی کوئی کتاب لکھ سکتا لیکن مجھے اس کا سلیقہ نہیں۔ میرے خیالات منتشر ہیں اور ان کا اظہار مشکل ہے۔"

میز پر سر ٹیک کر وہ پل بھر کچھ سوچتا رہا اور آہ بھر کر کہا:

"عزّت کا انجام بھی کس قدر عبرت ناک ہے۔"

دیر تک وہ چُپ بیٹھا رہا اور بالآخر بولا: "چلو، سو جائیں۔"

اپنی کوٹھری میں جاکر میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ بجلی آسمان پر کوند رہی تھی اور کھیتوں کو اُجال رہی تھی۔ اور جب وہ چمکتی تو پھیکا سا چاند گویا

خوف سے کانپنے لگتا۔ اگر کتوں کا شور و غوغا نہ ہوتا تو یقیناً احساس ہوتا کہ میں کسی سنسان جزیرے میں قید ہوں۔ افق کے پاس بادل گرج رہے تھے اور کھڑکی میں سے ہوکر گرم ہوا کے بھپارے آ رہے تھے۔

آنکھوں کے سامنے عزّت کی لاش گھوم رہی تھی۔ وہ بیدِ مجنوں کی جھاڑی میں پڑی ہوئی تھی۔ نیلا چہرہ آسمان کے مقابل تھا اور پتھرائی ہوئی آنکھیں اس کے باطن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سنہری ڈاڑھی مٹّی میں سنی ہوئی اور منھ حیرت سے کھُلا ہُوا! اور اس میں سے اس کا یہ محبوب جملہ نکل رہا تھا: "میکسم! مہر و محبّت کو زندگی کا نمک جانو۔" نیلی پتلون اس کی نیلی ٹانگوں میں چپک گئی تھی۔ چہرے پر مکھیاں بھنک رہی تھیں اور جسم سے سخت بدبو اُٹھ رہی تھی۔

سیڑھی پر پاؤں کی بھاری چاپ سنائی دی۔ خوکول اندر آکر میرے پلنگ پر بیٹھ گیا: "بھئی، میری شادی ہونے والی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کوئی عورت ——"

وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا جیسے مجھ سے کچھ سُننا چاہتا تھا۔ لیکن مجھ سے کچھ نہ کہا گیا کیوں کہ اسی وقت بجلی کی چمک سے آنکھیں چوندھیا گئیں۔

"ماریا دیرنکوف سے میری شادی ہو رہی ہے۔"

بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اور اس نے پوچھا:

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

"یونھی"

"تم سوچتے ہوگے کہ میں عمر میں اس سے بہت بڑا ہوں۔"

یہ تو نہیں۔"

"وہ مجھ سے کہتی تھی کہ کبھی تم اس سے محبت کرتے تھے۔"

"شاید یہ سچ ہے۔"

"تم اسے بھول چکے یا اب بھی دل میں کسک باقی ہے۔"

"نہیں، وہ تو بھولی ہوئی بات ہے۔"

اس نے متین لہجے میں کہا: "تمھاری عمر میں ہر گام پر دھوکا ہوتا ہے کہ دامِ محبت میں گرفتار ہوا۔ لیکن میری عمر میں یہ وسوسہ نہیں ہوتا۔ اس وقت اگر محبت ہوتی ہے تو آدمی کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور اسے کسی کام کے قابل نہیں رہنے دیتی۔"

وہ خود بہ خود مسکرا پڑا "انطونی کو دیکھو جو قلوبطرہ کی جستجو میں تخت و تاج کیا اپنی جان سے بھی جاتا رہا۔"

وہ تن کر کھڑا ہوگیا اور دوبارہ بولا: "جو بھی سمجھو ——— میں تو شادی کر رہا ہوں۔" یہ بات اس نے ایسے لہجے میں کہی گویا مجبوراً کوئی خطا کر رہا ہے۔

"جلدی ہی؟"

"خزاں میں ——— سیب کی فصل کے بعد"

اس کے جانے کے بعد میں پلنگ پر لیٹے لیٹے سوچنے لگا کہ خزاں میں بوریا بدھنا باندھ لینا ہوگا۔ خوکول نے انطونی کا ذکر جس پیرائے میں کیا وہ مجھے مطلق پسند نہ آیا۔

سیب توڑنے کا موسم قریب آرہا تھا۔ پیڑوں کی ڈالیاں پھلوں کی بہتات سے زمین کو چومنے لگی تھیں۔ سیب کے باغوں میں عجیب سی مہک پھیلی ہوئی تھی جسے نہ خوش بو کہہ سکتے تھے نہ بدبو۔ جو پھل سڑ کر یا ہوا کے زور سے زمین پر گر گئے تھے انھیں چننے کے لیے لونڈوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی

اگست کے آغاز میں خوکول دُکان کے لیے مال کا انبار لادے قازان سے کشتی پر آیا۔ صبح کا ذکر ہے، وہ نہا دھوکر کپڑے بدل چکا تھا۔ چائے بناتے ہوئے یہ سُنا ہی رہا تھا کہ رات کے وقت کشتی رانی میں کتنا لطف آتا ہے کہ یک بہ یک اس کی ناک اِدھر اُدھر گردش کرنے لگی اور وہ گھبراکر بولا: "کہیں کچھ جل رہا ہے کیا یہ ہوسکتا ہے؟"

اسی وقت آنگن سے ملازمہ چلّائی:

"گھر میں آگ لگ گئی۔"

ہم باہر دوڑے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مال گودام جو ہمارے باغ کے ایک کونے میں تھا آگ سے گھرا ہوا ہے۔ ذرا دیر ہم ہکّے بکّے بھوچکے آگ کی لپٹوں کو گھورتے رہے جو دیوار سے ہوکر چھت پر چڑھ رہی تھیں۔ ملازمہ پانی کی بالٹی لائی جسے ایک طرف پھینک کر خوکول نے آواز دی:

"میکسم، سارے پیپے باہر نکال دو۔ بڑی بی، تم دکان میں جاؤ۔"

مَیں نے فوراً تارکول کا ایک پیپہ گودام سے نکال کر سڑک پر لڑھکا دیا۔ لیکن جب مٹّی کے تیل کے پیپے پر ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ اس کی سیل ٹوٹ گئی ہے اور تیل زمین پر گر رہا ہے۔ مَیں چھید بند کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا لیکن آگ کب مہلت لینے دیتی تھی۔ شعلے لکڑی کے تختوں کی طرف جھپٹے، چھت چرمرانے لگی اور آتشیں نغمہ میرے کانوں میں بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ جب مَیں تیل کا پیپہ سڑک کے قریب لایا تو عورتیں اور بچّے ہر طرف شور مچاتے دوڑ رہے تھے۔ خوکول ملازمہ کی مدد سے دُکان کا سامان کھائی میں اُتار رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کی ایک سیاہ پوش عورت بیچ سڑک میں کھڑی ہمیں مکّا دکھاتی ہوئی زور سے چلّا رہی تھی:

"اُفوہ رے شیطانو!"

جب مَیں دوبارہ گودام میں گھُسا تو وہ دھنوئیں سے بھرا ہوا تھا اور ہر طرف سے جلن اور چیخ کی آوازیں آرہی تھیں۔ دیواریں گویا آتش بازی کا تماشا ہو رہا تھا اور چھت پر انگاروں کی جالی کا گمان ہوتا تھا۔ دھنوئیں کے مارے میری آنکھیں بند ہوگئیں اور دم گھُٹنے لگا۔ مجھ میں اندر سے دروازے تک ایک پیپا لانے کی بھی سکت نہ رہی۔ اور وہ کم بخت چوکھٹ سے اَڑ گیا اور کسی طرح ٹس سے مس نہ ہُوا۔ ادھر چھت سے چنگاریاں گر گر کر میری کھال پر نشتر زنی کرنے لگیں۔ مجبوراً مَیں نے 'یا علی مدد' کا نعرہ لگایا اور آن کی آن میں خوکول نے دوڑ کر میرا بازو تھام لیا۔ مجھے آنگن کی طرف دھکیلتے ہوے اس نے کہا:

"بھاگ جاؤ' پل بھر میں دھماکا ہونے والا ہے"

مَیں اس کے پیچھے گزرگاہ کی طرف لپکا اور پھر اپنی کتابوں کی ٹوہ میں اوپر کے حجرے میں گھُس گیا۔ ان سب کو باہر پھینک کر مَیں نے ٹوپیوں کے صندوق کو نیچے گرانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کھڑکی میں سے ہو کر نہ جا سکتا تھا۔ مَیں اسی فکر میں تھا کہ کھڑکی کے فریم کو کسی وزنی چیز سے توڑ دوں کہ ایک ہیبت ناک دھماکا ہوا اور مَیں سمجھ گیا کہ مٹی کے تیل کا کوئی پیپا پھٹ گیا ہے۔ اسی وقت دُکان کی چھت میں بھی آگ لگ گئی اور میرے سر کے عین اوپر اس کی لپٹ بھڑکنے لگی۔ گرمی کے مارے میرا بُرا حال ہوگیا۔ سیڑھیوں کی طرف بھاگا تو دھنوئیں کے بادلوں نے میری آؤ بھگت کی۔ آگ سُرخ زبان نکالے سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ اور گزرگاہ پر کڑکڑانے اور چیخنے کی آوازیں یوں آرہی تھی جیسے آگ لکڑی کے تختوں کو جبڑوں میں دبا کر توڑ رہی ہو۔

وحشت کے مارے مَیں یوں دم بہ خود ہوا کہ دیر تک حرکت نہ کرسکا۔ مجھے یاد ہی کہ میرے بال جلنے لگے تھے اور دم گھُٹ رہا تھا۔ محسوس ہوا کہ آخری وقت آگیا ہی۔ پانوٗ من من بھر کے ہوگئے اور آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔

اس کٹھن گھڑی میں یک بہ یک خیال آیا کہ جان بچانے کا ایک ہی راستہ ہی۔ جسم کو گدّے اور تکیے میں لپیٹ کر اور سر کو بھیڑ کی کھال سے ڈھانک کر میں کھڑکی سے نیچے کوٗد پڑا۔

جب ہوش آیا تو مَیں کھائی میں پڑا ہوُا تھا اور خوکول سامنے زمین پر بیٹھا للکار رہا تھا: "کیا بات ہی؟"

پانوٗ کے بل کھڑے ہوکر مَیں نے دیکھا کہ ہماری جھونپڑی جل کر بھسم ہوگئی ہی اور اس کی جگہ جلتے ہوے انگاروں کا انبار لگا ہوا ہی۔ خاک سیاہ زمین کو شعلے یوں چاٹ رہے تھے گویا عزرائیل کے کتّے چٹخارا بھر رہے ہوں۔ دریچوں سے کالے دھنوٗیں کے بھبکے اُٹھ رہے تھے اور جہاں چھت تھی وہاں آگ کے زرد زرد پھوٗل کھلے ہوے تھے۔

خوکول پھر پُکارا "کیا بات ہی؟" اس کا چہرہ آنسو، پسینے اور دھنوٗیں سے شرابور تھا۔ آنکھیں خوف کے مارے پھڑک رہی تھیں اور ڈاڑھی کے بال بہت میلے ہورہے تھے۔ خدا جانے کیوں مسرّت کی ایک لہر میرے جسم میں بجلی کی طرح دوڑ گئی اور اس کے بعد بائیں ٹانگ میں درد کا ایسا جھٹکا لگا کہ مَیں اوندھا پڑ گیا۔

"ٹانگ میں موچ آگئی ہی" مَیں نے خوکول سے کہا۔

اس نے میری ٹانگ کو ایسا جھٹکا دیا کہ جان سی نکل گئی۔ لیکن پل بھر بعد مَیں لنگڑا کر چلنے کے قابل ہوگیا۔ اور اطمینان سے بچا کھچا سامان

غسل خانے میں اُٹھا اُٹھا کر رکھنے لگا۔

خوکول نے بھی پائپ پیتے ہوئے خوشی کے لہجے میں کہا: "مَیں تو تم پر فاتحہ پڑھ چکا تھا۔ جب دُوسرا پیپا پھٹا تو مٹّی کے تیل کا فوّارہ چھت تک اُڑنے لگا۔ آگ کی لپٹ اُوپر کو اُٹھی اور فضا میں پھیل گئی۔ اور اچانک سارا گھر آگ کی ندی میں ڈُوب گیا۔ مَیں نے دل میں کہا کہ اب میکسم کا بچنا محال ہے۔"

اب وہ اپنی اصلی حالت میں آگیا اور سکون و قرار سے سامان کو ایک کونے میں سجانے لگا۔ ملازمہ کو جو خوف و ہراس سے بدحال ہورہی تھی اس نے حکم دیا: "مَیں آگ بُجھانے جاتا ہوں۔ تم یہاں بیٹھی رہو تاکہ کوئی کچھ اُٹھا نہ لے جائے۔"

دھوّاں کاغذ کے ادھ جلے ورق اُڑا اُڑا کر کھائی میں جمع کر رہا تھا۔ خوکول انھیں دیکھ کر حسرت سے بولا: "کتابوں کے جلنے کا مجھے بڑا غم ہے۔ وہی میری ہم دم و غم گسار تھیں ——"

اس دوران میں چار جھونپڑوں میں آگ لگ چکی تھی۔ ہوا بند تھی۔ اس لیے آگ آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر پھیل رہی تھی۔ پھُوس کی چھتوں پر گویا آگ کنگھی کر رہی تھی، دیواروں پر آگ گویا تصویریں بنا رہی تھی اور شعلوں سے ایک نہایت مہیب نغمہ نکل کر ہوا میں گونج رہا تھا۔ دھوّیں کے بادلوں سے سنہری چھینٹوں کی بارش گلی کوچوں میں ہو رہی تھی۔ کسان مرد و زن اپنی اپنی جان کی خیر مناتے ہوئے ہر طرف "پانی پانی" کی رٹ لگاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

لیکن پانی تو پہاڑی کے دامن میں دریا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا

تھا خوکول نے پکڑ دھکڑ کے کئی کسانوں کا حلقہ بنایا اور انھیں دو حصوں میں بانٹ کر ہدایت کی کہ آگ کے دائیں بائیں تمام دیواروں کو توڑ دیں۔

سب نے دُم کٹی بھیڑوں کی طرح اس کا حُکم مانا۔ اور اب آگ کے خلاف ایک باقاعدہ مہم شروع ہوگئی۔ لیکن کام کرنے والوں میں کوئی جوش نہ تھا گویا ذاتی طور پر انھیں اس معاملے سے کوئی دِل چسپی نہ ہو۔

مَیں ایسے جوش میں تھا کہ کبھی جسم میں ایسی طاقت محسوس نہ ہوئی تھی۔ سڑک کے سرے پر امیر زمینداروں کی بھیڑ نظر آئی جس میں ان کے سرغنے سرپنچ اور بنیا کزمن بھی تھے۔ وہ خاموش کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے اور بید یا ہاتھ ہلانے کے علاوہ کسی قِسم کی حرکت کے قائل نہ تھے۔ کھیتوں سے کسان گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے اُڑے چلے آتے تھے۔ عورتیں حسبِ عادت چلّا رہی تھیں اور بچّے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔

آگ ایک نئے مکان کے اِرد گِرد منڈلانے لگی۔ اسے بچانے کا بس یہی طریقہ تھا کہ باڑی کو جو سُوکھی شاخوں کی بنی ہوئی تھی فوراً کاٹ کر ہٹا دیا جائے۔ کسانوں نے کاٹ چھانٹ شروع بھی کی۔ لیکن جب انگارے چٹک چٹک کر ان پر گرنے لگے تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

خوکول نے آواز لگائی: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں"

لیکن جب اس للکار کا کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے کسی کی ٹوپی اُتار کر میرے سر پر منڈھ دی اور کہا:

"تم اس سرے سے کٹائی شروع کرو اور مَیں اس سرے کو سنبھال لوں گا"

مَیں نے کلہاڑی کے دو ایک وار کیے اور ساری باڑی اڑاتی ہوئی مجھ پر گر پڑی۔

خوکول پکار اٹھا: "میاں، جل تو نہیں گئے؟"

اس کے تردّد نے میرے حوصلے کو دوچند کردیا۔ یہ آدمی مجھے بہت عزیز تھا اور مَیں اس کی نظر میں ہر قیمت پر عزّت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی زبان سے تعریف کے دو جملے سُننے کے لیے مَیں بڑی سے بڑی قربانی کرسکتا تھا۔ ادھر دھوئیں کے کالے بادلوں میں کتابوں کے اوراق سفید پرندوں کی طرح اُڑ رہے تھے۔

دہنی طرف تو آگ کی پیش قدمی رُک گئی تھی۔ لیکن بائیں جانب اس کی یلغار جاری تھی اور دسویں جھونپڑی کا نمبر آپہنچا تھا۔ لہٰذا خوکول نے اپنے ہم ٹیروں کو بائیں جانب منتقل کردیا تھا۔ زمین داروں کے پاس سے گزرتے ہوئے مَیں نے کسی کی زبان سے یہ لفظ سُنا: "یہ آگ تو انھی کی سلگائی ہوئی ہے۔"

توندل کزمن نے کہا: "غسل خانے کی تلاشی لینا چاہیے۔"

یہ تو سب جانتے ہیں کہ مسرّت کا اشتعال ہو تو طاقت چوگنی ہوجاتی ہے۔ مجھ پر بھی یہی کیفیت غالب آگئی اور مَیں تب تک کام کرتا گیا جب تک تھک کر نڈھال نہ ہوگیا۔ مَیں چکرا کر شاید راکھ کی ڈھیری پر گر پڑا۔ آنکھ کھلی تو خوکول مجھ پر بالٹی سے پانی چھڑک رہا تھا اور کسان گھیرا باندھے آپس میں کہہ رہے تھے:

"فولادی پہلوان ہے"

"بڑا دِل گردہ ہے اس لونڈے میں"

مَیں خوکول کی ٹانگ سے لپٹ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو اٹھا۔ میرے سر کو تھپک کر اس نے کہا: "بہت کرچکے اب آرام کرو۔"

گمش کن اور بری نوف نے جو دھنوئیں میں رنگ کر بھوت پریت معلوم ہو رہے تھے مجھے اُٹھاکر کھائی میں لِٹا دیا اور کہا: "فکر نہ کرو، آگ بجھ گئی۔"

ابھی مَیں کمر سیدھی کر ہی رہا تھا کہ دس بارہ فربہ اندام زمیں دار کھائی کی ہمارے غسل خانے کی طرف روانہ ہوئے۔ سرپنچ آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے دو پولیس مین خوکول کو حراست میں لیے آ رہے تھے۔ غصّے کے مارے خوکول کا بُرا حال تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی نہ تھی، قمیص کی آستین پھٹ گئی تھی اور پائپ منھ میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ کانا سپاہی کوستین ہوا میں ڈنڈا ہلاتے ہوئے گدھے کی طرح رینک رہا تھا:

"کافر کو زندہ جلا دو!"

"غسل خانے کا دروازہ کھولو۔"

خوکول نے اکڑ کر کہا: "چابی گُم ہوگئی ہو، تالا توڑ دو۔"

مَیں اُچھل کھڑا ہوا اور زمین سے لاٹھی اُٹھا کر خوکول کے پاس جا کھڑا ہوا۔ پولیس مین ڈر کر پیچھے دبک گئے۔ اور سرپنچ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا:

"مقدّس کلیسا کی بھیڑو! تالا توڑنا بہت بڑا گناہ ہو۔"

کزمن نے میری طرف اشارہ کر کے کہا:

"یہ بھی اسی جتھے میں ہو —— اس کا نام کیا ہو؟"

خوکول نے کہا: "میکسم! مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کا خیال ہو کہ مَیں نے سامان غسل خانے میں چھپا کر خود دُکان میں آگ لگادی ہو۔"

"دونوں کافر ہیں!"

"تالا توڑ دو۔"

"کلیسا کی بھیڑو "

"ہماری ذمّے داری ہے "

خوکول نے کان میں کہا۔" پیٹھ سے پیٹھ لگاکر کھڑے ہوجاؤ تاکہ وہ پیچھے سے چوٹ نہ کرسکیں۔ "

تالا توڑکر کئی آدمی بہ یک وقت غسل خانے میں گھس گئے اور فوراً ہی باہر نکل آئے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ایک ڈنڈا خوکول کو بھی تھما دیا۔

"کچھ بھی نہیں ہے "

"کچھ نہیں ؟"

"تف ہے ای شیطانو !"

کسی نے مایوسی سے کہا: "کسانو! ساری محنت رایگاں گئی۔"

کئی لوگ دیوانوں کی طرح چیخ پڑے:

"کیا رایگاں ہوا؟"

"انھیں آگ میں پھینک دو۔"

"یہ لوگ باغی ہیں "

"سبھائیں بنا رہے ہیں۔"

"چور ہیں — سب کے سب چور ہیں۔"

خوکول نے ڈپٹ کر کہا: "بکواس مت کرو۔ تم نے دیکھ لیا کہ غسل خانے میں میں نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اب تم کیا چاہتے ہو۔ سب کچھ جل گیا۔ جو بچ گیا وہ یہ پڑا ہے۔ اپنا مال جلاکر مجھے کیا مل جاتا۔"

"اس کا تو بیمہ ہوچکا ہے۔"

دوبارہ ہر طرف سے آوازیں آئیں:

"ان کا منھ کیوں تاک رہے ہو؟"

"ہم نے بہت صبر کیا —— اب یہ نہ ہوگا"

میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور دھند میں مجھے کئی مہیب چہرے نظر آئے جن کے دہانے غارت گر غار کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے مَیں نے انھیں پیٹنے کی خواہش کو ضبط کیا۔ وہ سب بھوتوں کی طرح ناچتے ہوئے چلّا رہے تھے:

"اوہو —— ان کے ہاتھ میں ڈنڈے ہیں"

خوکول ہنسی نہ روک سکا: "مَیں تو اپنی ڈاڑھی کی خیر منا رہا ہوں میکسم یہ جانور تمھیں بھی نہ چھوڑیں گے۔ توبہ —— لیکن صبر کرو —— دیکھو ——"

کسی نے آواز دی: "چھُٹکا تو کلہاڑی لیے ہوئے ہے"

مَیں قطعاً بھول گیا تھا کہ پتلون کے کمربند میں کلہاڑی لٹکالی تھی۔

خوکول نے کہا: "ان کی ہمّت ٹوٹ رہی ہے۔ خیر جو بھی ہو تم کلہاڑی کو ہاتھ نہ لگانا"

ایک لنگڑا کسان بہت اُچھل کود رہا تھا اور اس نے وحشیوں کی طرح چیخ کر کہا: "دور جاکر ان پر سنگ باری کرو —— دیکھو ایسے"

یہ کہہ کر اس نے دراصل ایک پتھر میرے پیٹ پر کھینچ مارا۔ لیکن اسی وقت کُکش کن اس پر ٹوٹ پڑا اور دونوں کلائیاں کھاتے ہوئے کھائی میں گر پڑے۔ پن کوف اور بری نوف کے ساتھ ہمارے کئی رفیق ان کے پیچھے لپکے۔ اب تو سود خوار کزمن کے ہوش بھی درست ہوگئے اور اس نے لجاجت سے کہا:

" بھائی خوکول، آپ تو سمجھ دار ہیں ۔ اتنی بڑی آگ کو دیکھ کر کوئی کسان بگڑ بیٹھے تو ــــــ "

خوکول نے منھ سے پائپ نکال کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا: " میکسم، آؤ ۔ ندی پار کے چائے خانے میں چل کر بیٹھیں ۔" اور جب کزمن نے دوبارہ چونچ کھولی تو خوکول ڈپٹ پڑا: " ہٹ جا نابکار ۔"

جس جگہ ہماری جھونپڑی تھی اب سلگتے ہوئے انگاروں کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا ۔ تنور کی نلی اب تک صحیح و سالم تھی اور اس سے دھوئیں کی لہر اٹھ رہی تھی ۔ پلنگ کے جلتے ہوئے پائے مکڑی کی ٹانگوں کی طرح ابھرے ہوئے تھے ۔ دروازے کی بلیاں سنتریوں کی طرح اس خرابے کا پہرا دے رہی تھیں اور ایک پر آگ نے اب تک ایسی میناکاری کر رکھی تھی کہ اس پر مرغِ زریں کا گمان ہوتا تھا ۔

خوکول کے منھ سے ایک آہ نکلی: " کتابوں کے جلنے کا بڑا رنج ہے ۔"

سڑک پر چھوٹے چھوٹے بچے جلتی ہوئی چھپٹیوں کو پانی سے نہلا رہے تھے ۔ ان سے سنسناہٹ کی آواز آتی اور سفید سا بدبودار دھواں ہوا میں پھیل جاتا ۔ جن کے گھر جل گئے تھے وہ غم سے نڈھال یہاں وہاں کھڑے ہوئے بچے کھچے سامان کو ایک جگہ جمع کر رہے تھے ۔ عورتیں روتی ہوئی آپس میں لڑتی جاتی تھیں ۔ باغ میں درخت سر جوڑے خاموش کھڑے تھے ۔ ان کے پتے گرمی سے مرجھا گئے تھے اور سیبوں کی سرخ رنگت زیادہ نکھر آئی تھی ۔

ندی کے پانی میں نہا کر ہم چائے خانے میں جا بیٹھے اور فکر کے عالم میں چپ چاپ چائے پینے لگے ۔

تھوڑی دیر بعد پن کوف آیا ۔ میں نے کبھی اس پر سنجیدگی و متانت کی

یہ کیفیت نہیں دیکھی تھی۔

خوکول نے پوچھا: "کیا بات ہے بھائی!"

پن کوف نے شانہ ہلا کر جواب دیا: "مَیں نے مکان کا بیمہ کرالیا تھا۔"

یہ سُنتے ہی سکوت چھا گیا اور دونوں دیر تک ایک دوسرے کو اجنبیوں کی طرح گھورتے رہے۔

"خوکول، اب تم کیا کروگے؟"

"ابھی سوچا نہیں ہے۔"

"یہاں سے تو تمھیں ہجرت کرنی ہوگی۔"

"دیکھا جائے گا۔"

پن کوف نے کہا: "میری ایک تجویز ہے۔ آؤ، باہر چل کر باتیں کریں۔"

دروازے سے پلٹ کر وہ مجھ سے بولا: "تم میں تو بڑا دم خم ہے۔ تم گانو میں ہی رہو۔ سب تمھارا لوہا مانیں گے۔"

مَیں بھی باہر آکر ریت پر لیٹ گیا اور لہروں کو گننے لگا۔ سورج ڈوب چکا تھا، پھر بھی ہوا میں گرمی تھی۔ دیہات کی زندگی کا نقشہ میری آنکھوں کے آگے یوں آگیا گویا ندی کے پانی پر کھنچا ہوا ہو۔ دِل کی اُداسی کے باوجود تھکن کے مارے مجھے وہیں نیند آگئی۔

خواب میں مجھے کوئی پکارنے اور میرے شانے کو ہلانے لگا: "مر گئے ہو یا سو رہے ہو؟"

مرغزار پر چاندنی چٹک رہی تھی اور بری نوف پاس بیٹھا مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"اُٹھ بھی جاؤ، خوکول تمھاری وجہ سے پریشان ہو رہا ہے۔"

چلتے چلتے وہ بڑبڑانے لگا: "جہاں دیکھو پڑ کر سو رہے۔ اگر کوئی پہاڑی سے اُترتے ہوئے رپٹ جائے اور تم پر پتھر روڑا گرادے تو کیا ہو۔ اور یا جان بوجھ کر ہی تمھیں پتھر کا نشانہ بنادے تو کیا ہو۔ میاں، یہاں کے لوگ بڑے انتقام پرور ہیں اور شرافت چھو کر بھی نہیں گئی۔"

ندی پار کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور کسی کے پنجے دبا کر چلنے کی آہٹ سنائی دی۔

گمن نے کڑک کر پوچھا: "صاحب زادے کا پتا چلا؟"

"ساتھ لیے آرہا ہوں۔"

تھوڑی دور چل کر بری نوف نے کہا: "گمن کی زندگی بھی سخت ہے۔ بے چارا چھپ کر مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔"

خوکول مجھے دیکھتے ہی بگڑ پڑا: "آپ کو سیر کی سوجھی ہے۔ اور اگر کوئی حملہ کر دیتا تو کیا ہوتا۔"

جب ہم اکیلے رہ گئے تو اس نے اُداسی سے کہا: "پن کوف کی رائے ہے کہ تم اس کے ساتھ یہیں رہو۔ وہ نئی دُکان کھولنا چاہتا ہے۔ مَیں اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ یہ ضرور کہہ دوں کہ مَیں نے سارا مال اس کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے اور 'ویاتکا' نامی شہر میں منتقل ہو رہا ہوں۔ وہاں جا کر خط لکھوں گا اور کچھ عرصے بعد تمھیں بلوالوں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"مَیں سوچ کر کوئی فیصلہ کروں گا۔"

وہ فرش پر لیٹ کر کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ مَیں دریچے سے دریا کو تاکتا رہا جہاں چاندنی کی گل کاریاں آگ کے نظارے کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔ کسی اگن بوٹ کی چرخی پانی میں انتشار پیدا کر رہی تھی اور

اس کے مستول پر جگمگاتے ہوئے چراغ کبھی غائب اور کبھی نمایاں ہو جاتے تھے۔

خوکول نے خوابیدہ آواز میں پوچھا: "کیا تم کسانوں سے خفا ہو؟ یہ رویّہ مناسب نہیں۔ یہ لوگ محض احمق ہیں۔ ان کی بدطینتی کی وجہ بھی حماقت ہی ہے۔"

یہ سُن کر مجھے اطمینان نہ ہوا کیوں کہ الفاظ میرے غم و غصّے کو کم نہ کر سکتے تھے۔ میری آنکھوں کے آگے ان درندوں کی مورتیں ناچ رہی تھیں اور کانوں میں ان کا نعرۂ جنگ گونج رہا تھا۔

ابھی مجھ میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو درگزر کرنے کا وصف پیدا نہ ہوا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ فرداً فرداً کسانوں کی طبیعت میں زیادہ بدی نہ تھی، بلکہ کئی کو نیک کا لقب بھی دیا جاسکتا تھا۔ دراصل یہ خوش مزاج حیوان تھے۔ ذرا سی بات پر بھولے پن سے مسکرا دیتے اور بہادری کے قصّوں اور مسرّت کی تلاش کے واقعات کو طفلانہ اعتبار سے سُننے لگتے تھے۔ ان کے معصوم دل کو ہر وہ بات بھاتی تھی جو ان کے معیار کے مطابق آرام دہ زندگی کے تصوّر کو پرچائے۔

لیکن جب وہ گانو کی چوپال یا چائے خانے میں مِل کر بیٹھتے تو ان کی ساری نیکی کافور ہو جاتی تھی۔ پھر تو وہ پادریوں کی طرح منافقت و خباثت کی قبا پہن کر امیروں کی خدمت گزاری کا ایسا بہروپ بھرتے کہ اُبکائی آنے لگتی تھی۔ یا ذرا ذرا سی باتوں پر بھیڑوں کی طرح دانت نکوس کر ایک دوسرے پر غرّانے اور کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ ایسے موقعوں پر انھیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کل وہ بھیڑوں کی طرح سر جھکا کر جس کلیسا میں عبادت کرتے تھے آج اس میں آگ لگانے کو آمادہ ہو سکتے تھے۔ یُوں تو وہ گیت اور قصّے سُنانے والوں سے دلچسپی حاصل کرتے لیکن روزمرّہ کی زندگی میں ان سے حقارت سے پیش آتے

اور ہرگز ان کی کوئی مدد نہ کرتے تھے۔

سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ زندگی کیسے بسر ہوگی۔ جُدائی کے وقت مَیں نے دِل کھول کر یہ سب باتیں خوکول کو سُنائیں۔ اسے میرے خیالات پسند نہ آئے اور جواب دیا: "تم نے قبل از وقت یہ رائے قائم کرلی ہے۔"

"لیکن اس رائے کا بدلنا مشکل ہے، پھر مَیں کیا کروں؟"

"تمھاری رائے بے بنیاد ہے، اس میں اصلیت نہیں۔"

دیر تک وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا: "کسی کو دشنام دینے میں جلدی نہ کیا کرو۔ دُنیا میں سب سے آسان چیز دُوسروں کو بُرا کہنا ہے۔ ہر معاملے پر یہ سوچ کر ٹھنڈے دِل سے غور کیا کرو کہ سب کچھ بدل رہا ہے اور جو آج بُرا ہے کل سدھر بھی سکتا ہے۔ تبدیلی دیر میں ہوتی ہے۔ لیکن مایُوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز کو ٹھوک بجا کر دیکھو، اور دلیری و آزادی سے سوچو لیکن بُرائی کا فتوا دینے میں جلدی نہ کرو۔ اچھا، میرے پیارے، خدا حافظ۔"

اس کے پندرہ سال بعد خوکول سے دُوسری ملاقات ہوئی۔ اس دوران میں انقلابی پرچار کے جُرم میں وہ دوبارہ دس سال کے لیے سائبیریا بھیج دیا گیا تھا۔

خوکول سے جُدا ہونے کے بعد مَیں مایُوسی و بیزاری کے گرداب میں پھنس گیا۔ گانو میں میری حالت اس کتّے کی سی تھی جو اپنے مالک سے جُدا ہوگیا ہو۔ مَیں بری نوف کے غسل خانے میں رہنے لگا۔ اور اس کے ساتھ امیر کسانوں کے باغوں یا کھیتوں میں مزدوری کرکے پیٹ پالنے لگا۔

برسات کی ایک رات کو وہ پوچھنے لگا: "میکسم، تمھاری مثال اُس

لیڈر کی ہے جس کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ یہاں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ چلو کل ہی سمندر کی راہ پکڑیں۔ مذاق نہیں۔ یہاں ہم جیسوں کی قدر نہیں بلکہ یہ کم بخت شراب کے نشے میں بدمست ہوکر ہم پر بھی ہاتھ صاف کر بیٹھیں تو کچھ عجب نہیں ـــــ"

یہ بات بری نوف پہلے بھی مجھے سمجھا چکا تھا۔ وہ بھی ہمیشہ اُداس رہنے لگا تھا۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا کہ کوئی ایسا راہی ہے جو جنگل میں بھٹک گیا ہو۔

کوٹھری کی کھڑکی پر بارش کی بوچھار طبلہ سا بجا رہی تھی اور بجلی کبھی کبھی ہمارے سیہ خانے کو اُجال دیتی تھی۔

بری نوف نے سنجیدگی سے سوال کیا: "کل چلے چلیں نا؟"

چناں چہ دوسرے دن ہم روانہ ہوگئے۔

خزاں کی راتوں میں دریائے وولگا کی کشتی رانی میں جو لطف ہے اس کا بیان قلم سے ممکن نہیں۔ ہم عرشے پر بیٹھے ہوتے اور مانجھی پتوار لیے "ہائی سو" کی تان پر بجرے کو کھیتا رہتا تھا۔ بجرے کے ارد گرد پانی کی بے شمار موجیں دھیمے سُروں میں عجیب نغمہ چھیڑ دیتی تھیں۔ دریا کے اُوپر کالے بادلوں کا جلوس اور ہر طرف آہستہ آہستہ جنبش کرتی ہوئی تاریکی۔ محسوس ہوتا کہ ساری دُنیا پانی کی صورت میں بدل گئی ہے اور یہ پانی کسی ایسے ریگستان کی طرف بہا جا رہا ہے جہاں چاند سورج اور تاروں کا وجود ہی نہیں ہے۔

اس تاریکی میں اگن بوٹ پانی میں تلاطم پیدا کرتے ہوئے اس طرح ہانپ رہی تھی گویا کسی غیر مرئی طاقت سے لڑ رہی ہو۔ اس پر تین چراغ روشن تھے جن میں سے ایک کسی قدر بلندی پر جگمگا رہا تھا۔ ہمارے آس پاس

چار چراغ سنہری مچھلیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

بجرے کا مانجھی پوستین پہنے تھا۔ وہ بھی اس نظارے سے مسحور ہو کر یوں ساکت کھڑا ہو جاتا گویا پتھر کی مورت ہو۔ پھر اس کی زبان سے 'ہائی سو' کی صدا نہ سُنائی دیتی تھی۔

مَیں نے پوچھا: "میاں، تمھارا نام کیا ہو؟"

اس نے روکھے پن سے پلٹ کر کہا: "یہ جان کر تمھیں کیا مل جائے گا؟"

مَیں نے دیکھا کہ اس بھالو نما انسان کے جسم پر بالوں کا جنگل اُگا ہوا ہو اور اس کی آنکھوں کی جوت غائب ہو چکی ہو۔ لکڑی کے پیالے میں اس نے آدھی بوتل شراب انڈیلی اور اسے غٹاغٹ یوں پی گیا گویا پانی تھا۔ اور پھر توتے کی طرح سیب کترنے لگا۔ جب اگن بوٹ نے بجرے کو یک بہ یک دھکا دیا تو رسّی تھام کر وہ پکارا: "اللہ تیرا شکر ہو۔"

یہ اگن بوٹ چار بجروں کو استراخاں کھینچے لیے جا رہی تھی۔ بجروں میں ایران کے لیے مال بھرا ہوا تھا جس میں لوہا شکر اور اسی قسم کی چیزیں تھیں۔ بری نوف ہر صندوق اور تھیلے کو ٹٹول کر دیکھنے لگا اور پھر کچھ غور کے بعد کہا: "ان میں تو بندوق اور پستول کے سوا کچھ نہیں۔"

یہ سنتے ہی مانجھی کا مُکّا تن گیا: "ان باتوں سے تمھیں کیا غرض؟"

"مَیں سوچ رہا تھا ——"

"پٹنے کو تو جی نہیں چاہ رہا؟"

پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس مال بجرے پر سوار ہو گئے تھے اور ازراہِ عنایت ہم سے کرایہ طلب نہ کر کے مانجھیوں کا فرض انجام دینے کا معاملہ ہوا تھا۔ اس کے باوجود سب ہمیں بھکاری سمجھتے تھے۔

بری نوف نے غصّہ مجھ پر اُتارا: "تم ہمیشہ انسانیت کا قصیدہ پڑھا کرتے ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کم زور کو سب کچلتے ہیں —"

اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا تھا۔ سرمئی بادلوں کے پس منظر میں روشن مستولوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

مانجھی کی خاموشی سے مجھے سخت کوفت ہوئی۔ مَیں اس بدماغ کے پاس بیٹھنے پر مجبور تھا کیوں کہ بجرے کی دیکھ بھال میں اس کا ہاتھ بٹانا میرا کام تھا۔ جب ہم کسی مشکل مقام پر پہنچتے تو وہ آہستہ سے کہتا:

"پتوار سنبھالو۔"

پھر آہستہ سے بڑبڑاتا: "بس ٹھیک ہے۔"

اس سے گفتگو کی کوشش قطعاً بے کار تھی کیوں کہ ہر سوال کے جواب میں وہ کہہ دیتا:

"تمھیں اس سے کیا غرض؟"

سمجھ میں نہ آتا کہ یہ مسخرہ کس سوچ میں مگن ہے۔ ایک جگہ جہاں کوئی چھوٹی سی ندّی دریا میں آکر ملتی تھی اس نے شمال کی طرف دیکھ کر کہا: "بدکار کہیں کا!"

"بدکار کون ہے؟"

جواب ندارد۔

دُور سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ اس بے وقت کی راگنی نے مجھے یاد دلایا کہ اس تاریکی میں بھی زندگی کا تھوڑا بہت وجود باقی ہے۔

مانجھی اچانک بول اٹھا: "ادھر کے کتّے بدمزاج ہوتے ہیں۔"

"ادھر سے کون سی جگہ مراد ہے؟"

"ہر جگہ، ہمارے گھر کا کتا بھی کم وبیش پاگل ہے۔"

"تم رہنے والے کہاں کے ہو"

اس نے اپنے شہر کا نام بتلایا۔ الفاظ اس بھونڈے پن سے اس کے ہونٹوں سے ٹپکنے لگے گویا پھٹے ہوئے تھیلے سے آلو۔

اس نے پوچھا: "تمھارا ساتھی کون ہے؟ تمھارا چچا تو نہیں ہے؟ مجھ سے پوچھو تو بڑا گاودی ہے۔ میرا چچا آفت کا پرکالا ہے۔ جتنا امیر ہے اس سے زیادہ بدخصال۔"

پھر وہ اگن بوٹ کے مستول کے چراغ کو دیر تک گھورتا رہا جو اندھیرے میں یوں تھرک رہا تھا گویا جالے میں سنہرا مکڑا۔

"پتوار تھامے رہو ـــــــ اور ہاں یہ تو کہو کہ پڑھ لکھ بھی سکتے ہو؟ جانتے ہو کہ قانون کون بناتا ہے؟"

میرا جواب سُنے بغیر وہ کہنے لگا: "اس کے متعلّق جتنے منھ اتنی باتیں سُنی جاتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ قانون ساز زار ہے، کوئی اس کے وزیر کا نام لیتا ہے تو کوئی بڑے پادری کا۔ اگر مجھے صحیح طور پر معلوم ہوجائے تو جا کر کہوں کہ قانون ایسا اٹل اور اچل بناؤ کہ کوئی کسی کے خلاف ہاتھ نہ اٹھا سکے۔ قانون کو فولاد کی طرح سخت ہونا چاہیے۔ پھر تو میں بھی اس کی پابندی کروں گا۔ لیکن موجودہ حالت میں یہ میرے امکان سے باہر ہے۔"

دیر تک وہ آپ ہی آپ باتیں کرتا رہا اور آخر میں اس کی بکواس بالکل بے معنی ہوگئی۔

اگن بوٹ پر کوئی اس زور سے چلّایا کہ ہمارے اس نقارے کی آواز بھی دب گئی۔ کتّوں کا شور تو رات کی گہرائیوں میں گُم ہوگیا تھا لیکن یہ انسانی

آواز ان سے بھی زیادہ ناگوارِ خاطر تھی۔ کالی رنگت کے پانی پر روشنی کی پیلی پیلی جھلکیاں اُبھرتی چھپتی رہتی تھیں۔ اوپر گھن گھور گھٹا چھائی ہوئی تھی اور ہم تاریکی کے آغوش میں گُھسے چلے جا رہے تھے اور مَیں بیزاری اور مایوسی کے کُہر میں کھویا ہوا تھا۔

بادلوں کا گھونگھٹ ہٹا کر صبح کی دیوی نے دُنیا کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ سورج کی شفقت سے محروم زرد و بے نور تھی۔ اس وجہ سے پانی کی رنگت بھی سیسے کی مانند بے رونق تھی۔ ساحل کے پیڑ پودے بھی مرجھائے ہوئے تھے اور گمان ہوتا کہ ان پر زنگ لگ گیا ہے۔ صبح کے دھندلکے میں دیہات کی جھونپڑیوں میں کاغذی تصویروں کا شبہ ہوتا تھا۔

اب اپنا کام ختم کر کے مَیں تختے پر لیٹ گیا اور بوریا اوڑھ کر فوراً سو گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد چیخ پکار اور ہائے دوہائی کی صداؤں نے مجھے جگا دیا۔ آنکھ کھول کر کیا دیکھتا ہوں کہ تین جہازیوں نے مانجھی کو پکڑ رکھا ہے اور اس قسم کا بے تکا شور اُٹھ رہا ہے۔

"بس کرو بھائی"

"لیکن مَیں کیا کر رہا ہوں؟"

"بہت ہو چکا۔"

وہ ہاتھ باندھے چُپ کھڑا تھا۔ اور انھیں باری باری سے دیکھ کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا: "مجھے اپنے گناہوں سے نجات حاصل کرنے دو۔"

وہ ننگے پانو اور ننگے سر صرف قمیص پاے جامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چوڑے چکلے ماتھے پر میلے بالوں کی لٹ جھول رہی تھی اور اس کے نیچے چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھیں گھبرائی ہوئی چتونوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں

تینوں نے بیک آواز کہا: "تم ڈوب جاؤ گے"۔

"ہرگز نہیں۔ دوستو مجھے چھوڑ دو، مَیں اس کا خون پی کر رہوں گا"

لیکن تینوں نے اسے جکڑ لیا اور وہ ایک شہتیر کو تھام کر یوں جُھک گیا گویا صلیب پر چڑھا دیا گیا ہو۔ "مجھے اپنے گناہ سے نجات حاصل کرنے دو" اس نے کہا۔

اس کی آواز خلافِ معمول گہری اور درد میں سموئی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کمزور ٹہنیوں کی طرح کانپ رہے تھے، اس کا خوف ناک چہرا گھنی ڈاڑھی کی آڑ میں تھرّا رہا تھا اور آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ بس یہ لگتا تھا کہ کوئی غیر مرئی ہاتھ اس کی گردن پکڑ کر مروڑ رہا ہو۔

کسانوں نے چُپ چاپ اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ اس نے ایک بقچہ بغل میں دبایا اور 'شکریہ' کہہ کر پھُرتی سے پانی کے اندر کُود پڑا۔ مَیں اُٹھ کر دوڑا تو مانجھی کا سر پانی میں کاگ کی طرح چڑھ اُتر رہا تھا۔ وہ دھارے کے مخالف کنارے کی طرف تیر رہا تھا۔ جہاں شاخوں کو ہَوا جھولا جُھلا رہی تھی اور ان کی زرد زرد پتّیاں پانی میں بکھری ہوئی تھیں۔

کسانوں نے کہا: "اپنی ضد کا پکّا تھا۔"

مَیں نے پوچھا: "پاگل تو نہیں تھا؟"

"نہیں جی! یہ تو اس نے اپنی رُوح کی بخشش کے لیے کیا ہے۔"

اس وقت تک مانجھی کنارے پہنچ گیا تھا۔ کمر کمر پانی میں ٹھہر کر اور بقچہ ہَوا میں ہلا کر وہ زور سے پکارا: "خدا حافظ"

کسی نے پوچھا: "پاس پورٹ بغیر اس کا کام کیسے چلے گا؟"

ایک سُرخ ریش جہازی نے اطمینان سے کہا: "پاس کے شہر میں اس کا

چچا رہتا ہے۔ اس سے اس نے بڑی کمینہ حرکت کی بلکہ اُسے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بدلا لینے کے لیے اس نے اسے مار نے کا ارادہ کیا لیکن پھر گناہ کے خیال سے رُک گیا۔ کسان کو جانور سمجھو لیکن اس کے نیک دِل ہونے میں شبہ نہیں ـــــ"

کسانوں کا حال تو خدا جانے مگر جہازیوں کی شرافت کا مَیں قائل ہوگیا کئی نسلوں سے یہ لوگ وولگا کے علاقے میں رہتے آئے تھے۔ مَیں بھی ان کا ہم وطن تھا اس لیے ان کی صحبت میں مجھے رُوحانی مسرت ملتی تھی لیکن دُوسرے دن جب ان کی مشتبہ نگاہوں سے آنکھیں چار ہوئیں تو مَیں فوراً سمجھ گیا کہ وہ احمق برِی نوف انھیں میرے متعلق جھوٹ سچ قصے سناتا رہا ہے۔

پُوچھنے پر اس نے اس امر کا اعتراف بھی کیا اور اس کا چہرہ شرم سے لال ہوگیا۔

"لیکن مَیں نے تو تمھیں منع کیا تھا۔"

"مَیں نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ لیکن ایک واقعہ اس قدر دل چسپ تھا کہ زبان رُک ہی نہ سکی ـــــ"

پُوچھ گچھ سے معلوم ہوا کہ برِی نوف نے ایک من گھڑت افسانہ تراشا تھا جس کی بنا پر مَیں نے خوخول کے ساتھ کلہاڑیاں لے کر کسانوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس پر خفا ہونا بے کار تھا کیوں کہ اس کے نزدیک حقیقت وہاں شروع ہوتی تھی جہاں واقعات ختم ہوتے ہیں۔ ایک دِن کسی کھیت کی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے عقیدے کا اعلان کیا تھا کہ حق و ناحق کی تلاش ہر فرد کو اپنے دِل میں کرنی چاہیے۔" وہ دیکھو' بھیڑوں کا گلہ جا رہا ہے اور ان کی نگرانی ایک گڈریا اپنے کتے کے ساتھ کر رہا ہے۔ ہماری رُوح کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

میاں شریف اور نیک انسان تو دُنیا میں ملتے نہیں۔ انھی بدمعاشوں اور بدکاروں میں حقیقت تلاش کر سکو تو کر لو۔"

جب سمبرسک کا شہر آیا تو جہازیوں نے نہایت نامعقولیت سے ہمیں زمین پر اُتر جانے کا حکم دے دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ تم دونوں دوسری قماش کے آدمی ہو۔

مجبوراً ہم ندی میں نہا دھوکر کنارے کے چائے خانے میں جا بیٹھے۔اس وقت دونوں کی جمع پونجی ایک رُپے سے زیادہ نہ ہوگی۔

مَیں نے پُوچھا: "اب کیا کِیا جائے؟"

"صاحب زادے، مُلکِ خدا تنگ نیست۔ ہم اپنی منزلِ کو پہنچ کر رہیں گے۔"

ہم بِلا ٹکٹ سمارا کے شہر کو جا پہنچے اور وہاں سے ایک بجرے پر کام کرتے ہوئے سات دِن کے سفر کے بعد بحیرۂ خضر کے ساحل کو چھوکر دم لیا۔ ماہی گیروں کی ایک ٹولی میں ہمیں شرکت کا موقع آسانی سے مِل گیا۔

دُوسرا باب

چوکی داری کا پیشہ

مَیں ایک ریلوے اسٹیشن پر چوکی داری کی خدمت انجام دینے لگا تھا۔ شام کے جھٹ پٹے سے لے کر صبح کے دھندلکے تک ہاتھ میں ڈنڈا لیے مال گودام کا گشت لگایا کرتا تھا۔ ترکستان کے لق و دق صحرا سے آندھیاں اُٹھ کر برفانی بادلوں سے چھنتی ہوئی اس زور شور سے آتیں گویا ہزاروں بھٹیوں کے منھ کھُل گئے ہوں۔ برستے ہوئے برف کی چادر کو ہٹا کر رات بھر انجن مٹرگشت کیا کرتے اور ہانپتے کانپتے ہوئے لاتعداد گاڑیوں کو یوں کھینچے لیے جاتے گویا کوئی آہستہ آہستہ زمین کو زنجیر سے جکڑ رہا ہو اور اس زنجیر کی پہلی کڑی آسمان میں چھپی ہوئی ہو جو بذاتِ خود برف کے ذرّوں میں منتقل ہو کر نیچے گر رہا ہو۔ دھنویں کی سنسناہٹ، لوہے کی کھنک اور سیٹی کی چیخ پکار ہوا میں گھل مل کر جانے کہاں غائب ہو جاتی تھی۔

آخری گودام کے پاس برف کے گالوں میں دو آدمی چلتے پھرتے ہوئے نظر آئے۔ یہ قزاق تھے جو آٹا چُرانے کی گھات میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کسی گڑھے میں چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے بھکاریوں کی طرح گڑگڑا کر

کہا: "بابا، ایک چٹکی آٹا دے دے"۔ پھر اسی نے رُپے کا لالچ بھی دیا اور جب میں ٹس سے مس نہ ہوا تو قتل کی دھمکی دینے لگا۔

میں نے کہا: "لوگو، یہ اڑان گھائیاں اور کسی کو بتانا"۔

ان کی بات پر میں نے کوئی دھیان نہ دیا کیوں کہ وہ ایسے محتاج تو نہیں تھے کہ ضرورت سے مجبور ہوکر چوری کریں۔ بلکہ وہ ایسے لوگ تھے جو چوری کا مال بیچ کر شراب اور عورتیں خریدا کرتے تھے۔

کبھی کبھی ایک سپاہی کی رنگیلی جورو، گرافووا، اسی مہم پر آتی تھی۔ اس نے چوکی داروں کو رشوت دینے کا یہ طریقہ سوچا تھا کہ قمیص اور کوٹ کے بٹن کھول کر اپنے سینوں کا نظارہ دکھاتی تھی اور وہ دونوں سیب کی طرح سخت اور نوکِ پیکاں کی طرح نکیلے تھے۔

انھیں چھیڑنے کے لیے وہ کہتی: "ذرا ان توبچوں کو دیکھو اور کہو کہ کیا دوگے۔ آٹے کی ایک بوری؟ چلو آدھی ہی سہی"۔

بےکوف نامی ایک بے وقوف اور شہر عثمان کا ایک تاتار ابراہیم اس سے دیر تک سودا طے کرتے۔ اور وہ ان کے آگے اپنے عریاں جسم کو تھرکاتی ہوئی کھڑی رہتی جس کی مرمریں جلد پر برف گر گر کر پگھلتی جاتی تھی۔

پھر وہ انھیں ڈانٹنے لگتی: "ارے درندو! جلدی بھی کرو۔ کتو، مجھ جیسی نئی نویلی تمھیں اور کہاں ملے گی"۔

روسی کسانوں سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس کی آواز میں بانکپن تھا اور بلی جیسی تیز آنکھیں اس کے حسین چہرے میں نکھار پیدا کرتی تھیں۔ جب ابراہیم اسے لے کر گودام کی چھت پر چڑھ جاتا تو اس فاحشہ کے ساتھی آٹے کی ایک بوری لے کر چمپت ہو جاتے تھے

گرافووا کی بے حیائی دیکھ کر مجھے اُبکائی آتی تھی لیکن اس کے حسین وجمیل جسم کے ناجائز استعمال سے مجھے کوفت بھی ہوتی تھی۔ ابراہیم اس کے بوسوں کا ذکر کرتے وقت کھکھار کر تھوکتا جاتا اور اسے ہمیشہ کتیا کہا کرتا۔ بےکوف نہایت سنجیدگی سے فتوا دیتا کہ "ایسی عورتوں کو سنگسار کر دینا چاہیے۔"

چھٹی کے دن وہ بن ٹھن کر شہر کی سیر کو نکلتی تھی۔ اس کے کالے کالے گھنے بالوں پر ایک سُرخ شال پڑی ہوتی اور جوتے جوشِ رفتار سے چرمرانے لگتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے حُسن کے خریداروں سے حقارت سے پیش آتی اور صرف پڑھے لکھوں کو لائقِ التفات گردانتی تھی۔

کبھی کبھی وہ مجھ سے بھی چھیڑ چھاڑ کرتی تھی لیکن میں اسے اپنے گودام کے قریب پھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔ لیکن ایک تاروں بھری رات کو ایسی نیند آئی کہ میں سیڑھی پر لیٹ کر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو وہ ہرجائی لٹ چھٹکائے چاندنی میں اپنے بدن کی پھبن دکھلاتی ہوئی سامنے کھڑی تھی۔ بولی:۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں چوری نہیں بلکہ سیر کی نیت سے ادھر آئی ہوں۔"

تاروں کو دیکھ کر میں تاڑ گیا کہ آدھی رات گزر چکی ہے۔ میں نے کہا:

"یہ بھی بھلا سیر کا وقت ہے۔"

میرے پاس بیٹھ کر اس نے جواب دیا۔ "عورت تو صرف رات کو زندہ ہوتی ہے۔ اور تمھیں سونے کا کس نے حکم دیا؟ کیا اسی کی تنخواہ لیتے ہو؟"

اس کے تمتماتے ہوئے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھوں میں بلا کی دل کشی تھی۔ اتنے میں آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور گرافووا نے صلیب کا نشان بنا کر کہا: "خدا اس روح کو امان دے۔ میری روح بھی اسی طرح پاش پاش ہو کر گر پڑے گی ———— تمھیں کون سی راتیں بھلی لگتی ہیں، اندھیری یا اجیالی۔

چاندنی راتوں میں تو مجھے خفقان اُٹھتا ہی۔"

سگریٹ زمین پر پھینک کر اس نے اس پر تھوک دیا اور جمہائی لے کر بولی: "آؤ پیارے، دو گھڑی جی بہلالیں۔"

جب مَیں نے انکار کیا تو اس نے لاپروائی سے کہا:

"جو میرے ساتھ ایک رات بسر کرتا ہی عمر بھر درود پڑھتا ہی۔ سب میرا دم بھرتے ہیں ——"

مَیں نے بہت نرم الفاظ میں اس کی بے حیائی پر نکتہ چینی کی جسے سُن کر اس نے متانت سے جواب دیا:۔

"زندگی کی کوفت نے مجھ سے حیا کا احساس چھین لیا۔ دنیا بے رنگ ہی اور مرد ——"

مرد کا لفظ اس کی زبان پر اتنا اجنبی لگا کہ میرے کانوں کو گراں گزرا۔ لیکن وہ آسمان کو تاکتی ہوئی دھیرے دھیرے کہنے لگی: "میرا کیا گناہ میاں۔ لوگوں کا کہنا ہی کہ خالق نے عورت کی قدر و قیمت اس کی ٹانگوں میں پنہاں کردی! اس میں میرا کیا قصور ——"

پل بھر بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے کہا:

"خیر، اسٹیشن ماسٹر سے ہی مل آؤں۔"

وہ چاندنی میں جگمگاتی ہوئی پٹریوں پر بل کھاتی ہوئی چلی گئی۔ لیکن مَیں سکتے کی حالت میں وہیں بیٹھا رہا اور اس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے:۔

"دنیا بے رنگ ہی اور مرد ——"

اس عمر میں میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ جو کھلی ہوا میں پلے اور

بڑھے ہوں ان کے لیے ماحول کس قسم کی بے رنگی پیدا کرسکتا ہے۔ ان کے بیابانوں میں دِن کو سورج اور رات کو چاند چمکتا تھا اور میدانوں کی وسعت انسان کو اس کی کم مائیگی کا احساس دلاتی تھی۔

میرے جاننے والے میرے ماضی سے قطعاً ناآشنا تھے۔ ان میں سے ہر ایک میری رُوح پر اپنا سایہ ڈال جاتا۔ اور ان سایوں کی تاریکی میں احساس ہوتا کہ مَیں اس حقیقت کی تلاش کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا ہوں جو ابد تک کسی پر عیاں نہ ہوگی۔

قوی ہیکل اسٹیشن ماسٹر ہیرڈسکی کی تصویر میری آنکھوں کے آگے پھرا کرتی تھی۔۔ اس کے چہرے پر لمبی کالی ڈاڑھی لہرایا کرتی تھی اور جسم پر گویا جنگل اُگا ہُوا تھا۔ جب وہ بولتا تو معلوم ہوتا کہ یہ گہری آواز کسی اور کی ہے اور غصّے کے وقت اس کی ناک میں آپ ہی آپ سیٹی بجنے لگتی تھی۔ وہ پرلے درجے کا چور بھی تھا اور قلیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پارسلوں میں سے کپڑے یا میوے نکال لیتا اور اس مال کو بیچ کر گھر پر راتوں کو محفلِ نشاط جمایا کرتا تھا۔ بڑا ظالم بھی تھا اور اکثر قلیوں یا چوکی داروں کو پیٹا کرتا تھا۔ مَیں نے کئی آدمیوں کی زبانی سُنا کہ اس نے مار مار کر اپنی بیوی کی جان نکال دی تھی

فرصت کے وقت وہ سُرخ ریشم کی قمیص پر مخمل کی تنگ پتلون اور تاتاری انداز کے سبز بُوٹ پہن لیتا۔ ان پر مستزاد وہ سنہری ٹوپی تھی۔ جو کالے بالوں کے ایک گوشے میں جمی ہوئی ہوتی۔ اس لباس میں اس پر کسی بازاری گویّے کا دھوکا ہوسکتا تھا۔

اس کے مہمانوں میں پولیس کا داروغہ 'مسلوف' بھی تھا۔ وہ اوّل نمبر کا مکّار و عیّار تھا۔ اس کی ناک گِدھوں کی سی اور آنکھیں طوائفوں کی سی

پُرفریب تھی - دُوسرا مہمان صابن ساز تخون تھا، اِس کسان کی شکل صورت گنوارُو اور ڈیل ڈول سانڈ کا سا تھا۔ اس کے کارخانے کے کئی مزدُوروں پر زہر کا ایسا مہلک اثر ہوتا کہ وہ جیتے جی مُردوں سے بدتر ہوجاتے۔ اور اس الزام میں تخون پر کئی مرتبہ جرمانہ بھی ہوچکا تھا۔ کانا پادری واروشلوف بھی ان محفلوں میں شریک ہوتا۔ یوں تو یہ متوالا اور غلاظت کی پوٹ تھا لیکن ہارمونیم اور رباب بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس کے چہرے پر اُبھری ہوئی گال کی ہڈیوں اور چیچک کے داغوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سارے جسم میں ہاتھوں اور کانی آنکھ کے سوا کوئی چیز خوب صورت نہ تھی۔ ہاتھوں میں زنانہ نزاکت تھی اور کانی آنکھ کی نیلی رنگت اتنی بھلی لگتی تھی کہ سب نے اسے "آنکھ چور" کا لقب دے رکھا تھا۔

ان مہمانوں کے علاوہ قصبے کی چنچل چھوکریاں بھی ان محفلوں کو رونق بخشنے آتی تھیں۔ کبھی کبھی چند نوجوان قزاق گرافودا کو لے کر آجاتے تھے۔ چھوٹے سے کمرے میں گول میز کے اِردگرد سب لوگ بیٹھ جاتے تھے۔ میز پر انواع و اقسام کے کھانوں کے ساتھ شراب کی بوتلیں چُنی ہوتی تھیں۔ گھنٹوں سب لوگ چپ چاپ کھانے پینے کا شغل جاری رکھتے تھے۔ یہ فرض انجام دے کر تخون زور کی ڈکار لیتے ہوئے صلیب کا نشان بناتا اور پادری رباب تنتنانے لگتا تھا۔ اب سب اُٹھ کر بازُو کے بڑے سے کمرے میں چلے جاتے اور ناچ رنگ کی سبھا جم جاتی تھی۔

اس موسیقی میں جادُو کا اثر تھا۔ مردوں کی آواز میں جوش اور زور تھا۔ عورتوں کی آواز میں بھی موہنی تھی جن میں ایک قزاق حسینہ سب سے ممتاز تھی۔ لیکن گرافودا کی آواز بے سُری تھی۔ سب لوگ سر جھکا کر اس

ادب قاعدے سے گاتے گویا کلیسا میں کھڑے ہیں۔ ان کے گیتوں میں عموماً اتنی اُداسی ہوتی کہ دِل بھر آتا تھا۔

اتنے میں اسٹیشن ماسٹر کڑک کر کہتا: "پادری، اب ناچ بھی ہو جائے ——— ارے میاں تخون، یہ پھیکاپن کیسا ۔"

پادری رباب کی گت بدل کر ناچ کی تال پر آجاتا اور تخون ناچ شروع کردیتا۔ صابن ساز کا مخمور جسم نزاکت اور نفاست سے یوں پیچ و خم کھانے لگتا گویا حوض میں مچھلی تیر رہی ہو۔ اور گو وہ قزّاق حسینہ بھی اس کے اِرد گرد دِل رُبا انداز سے تھرکنے لگتی تھی لیکن تخون کے تاؤ بھاؤ اور ہم تال کا مقابلہ کون کرسکتا تھا۔ اس کا ناچ سب کے نشے کو دوبالا کردیتا تھا۔

اسٹیشن ماسٹر خوشی کے مارے دیوانہ وار کبھی چِلاّتا، کبھی سیٹی بجاتا اور کبھی رونے لگتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ تخون کو چوم کر پُکار اُٹھتا: "معجزہ ہی معجزہ ——— تیرے سب گناہ بخش دیے جائیں گے۔"

اور اُدھر وہ پولیس کا داروغہ اس کی بلائیں لے کر چِلاّنے لگتا:

"تخون ——— زار ——— قاتل ——— خدا کی دین!"

اس وقت تک یہ لوگ شراب کے دو گیلن غٹک چکے تھے۔ لیکن طرب و نشاط کا دَور اب جاکر شروع ہوا تھا۔ لیکن اِن کے کیف کی وجہ شراب نہیں بلکہ اِس گرمیٔ صحبت کا فیض تھا۔ عورتوں کے تمتمائے ہوئے لال لال گال اور چڑھی ہوئی آنکھیں بتلا رہی تھیں کہ وہ بھی مخمور ہیں۔ وہاں سے وہ رُخِ زیبا کو ہوا دے رہی تھیں۔ اور وہ ان گھوڑیوں کی طرح مشتعل تھیں جنھیں اندھیرے اصطبل سے کئی دن بعد نکال کر میدان کی دھوپ میں کھڑا کردیا جاتا ہے۔ گرافو دا زور زور سے ہانپتی ہوئی تخون کو غضب آلود نگاہوں

سے گھور رہی تھی۔ ہَوا کے جھکڑ دریچوں کو ہلا رہے تھے اور چمنی کے اندر بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

تخون نے رنگین رومال سے منھ کا پسینہ پونچھتے ہوے کہا:

"اگر مجھے ناچ نہ آتا ہو تو کوئی شریف آدمی مجھ سے سیدھے منھ بات بھی نہ کرے ـــــــ۔"

یہ سُنتے ہی اسٹیشن ماسٹر آگ بگولا ہو گیا اور شریفوں کو وہ اچھوتی گالیاں سُنائیں کہ عورتیں شرم و حیا کا نام رکھنے کے لیے جھوٹ موٹ اللہ توبہ کرنے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روسی زبان کے لوچ کا اندازہ گالی گلوچ سُن کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔

زرا دیر بعد پادری نے پھر رباب کے تاروں کو چھیڑا اور اسٹیشن ماسٹر نے گویا طوفان کا رقص شروع کر دیا۔ اس کی تال پر ہر طرف سے شور و غوغا بلند ہوا اور گرافودا بھی دیوانہ وار ناچنے لگی:

"سیٹیوں اور تالیوں کے شور اور پیروں کی اٹھا پٹک سے زمین کانپنے لگی۔ رنگین لہنگوں کی لپ جھپ نے اور بھی قیامت ڈھائی۔

اس ہنگامہ خیز مسرت میں ہنسی کھیل کا کوئی پہلو نہ تھا بلکہ ایک مذہبی وجدان کی کیفیت تھی۔ مجھے تو کوہِ قاف کے درویشوں کے حال و قال کی یاد آنے لگی۔ اس جنوں خیز رقص میں بلا کی قوت تھی لیکن اس کا رُخ تباہی کی طرف تھا اور انسانی قوت کو یوں ضائع ہوتے ہوے دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوتا تھا۔ اس محفل کے افراد کے ہوش مند ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ اپنی اپنی جگہ پر سب میں خداداد ذہانت تھی۔ لیکن نغمہ و رقص اور شراب و شباب کے نشے میں وہ جس طرح بدمست ہو جاتے تھے اور صوت و حرکت کے حُسن

کو زیر کرکے وہ جس طرح مسرور ہوتے تھے یہ ان وحشیوں کا وتیرہ تھا جو کوئی مذہبی رسم ادا کر رہے ہوں۔

اسٹیشن ماسٹر مجھے بھی اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا تھا۔ اس الطاف کی وجہ یہ تھی کہ مجھے بہت سے میٹھے میٹھے گیت یاد تھے جنھیں میں سُریلی آواز میں گالیا کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ میں کتنی ہی شراب پیوں لیکن مدہوش کبھی نہ ہوتا تھا۔

اب میرے گانے کی باری آئی۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے گیت گائے جن میں کسک اور درد ہو۔ گاتے وقت میں ان کے مستور خیال و زبان کے حُسن کو ہویدا کرتا جاتا تھا اور خود اس اُداسی میں ڈوبتا جاتا تھا جو میرے دماغ کے انکار کے باوجود دِل کے اندر ہمیشہ پوشیدہ رہتی تھی۔

"خدا کی قدرت!" یہ کہہ کر پادری نے اپنے ہاتھ بالوں میں چھپالیے۔ تخون مجھے حیرت اور رشک سے تاکنے لگا۔ اسٹیشن ماسٹر نے اپنے دانت اس زور سے بھینچے کہ گال کی ہڈیاں گٹھلیوں کی طرح اکڑ گئیں اور پولیس کا داروغہ اس قزاق حسینہ کو دم بھر کے لیے بھول کر زمین کو بیمار کتّے کی طرح گھورنے لگا۔

خبر نہیں کہ ان آدمیوں سے میں کیا چاہتا تھا۔ لیکن کبھی یہ خیال آتا کہ اگر میرے گیت ان کے دِلوں کو نرم کردیں تو ان میں کوئی ایسی تبدیلی ہوجائے گی کہ میں ان کے اصلی روپ کو پہچان سکوں گا۔ سب کے سب فرطِ جوش میں مجھے گلے لگاکر چوم رہے تھے اور پادری کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

داروغہ نے میرے ہاتھوں کو تھپک کر کہا: "بدمعاش کہیں کے!"

اسٹیشن ماسٹر گرج پڑا: "شراب پیے جاؤ، کیوں کہ بہرصورت تمھیں جہنم ہی جانا ہے"

گرافووا نے ہاتھ مٹکا کر کہا: "مَیں تو اس لونڈے پر سو جان سے فدا ہوں۔ لوگو، سُن لو۔ میری دونوں ٹانگوں میں لرزش ہو رہی ہے ——"

مَیں جانتا تھا کہ یہ سب بے کار قسم کے آدمی ہیں۔ البتہ وہ دیوانہ وار حُسن کی عبادت کرتے تھے اور اس میں ایسے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے کہ اس کی خاطر اپنی جان تک گنوا دیتے تھے۔

اب ان کا جوش انتہا کو پہنچ گیا تھا لیکن صرف نغمہ و رقص سے ان کی پیاس نہیں بُجھ سکتی تھی۔

اسٹیشن ماسٹر نے چلّا کر کہا: "عورتوں کے کپڑے اُتار دو!"

یہ فرض تخون کے سپرد کیا جاتا تھا۔ وہ نہایت آرام سے بٹن اور کمربند وغیرہ کھول کر قمیصوں اور لہنگوں کو صفائی سے تہ کرکے کونے میں رکھ دیا کرتا تھا۔

سب سے پہلے وہ لوگ گرافووا کے جسمِ نازنیں کا معائنہ کرتے تھے۔ کمال احتیاط سے اس کے شہوت خیز سینے اور سڈول رانوں کو سہلاتے تھے۔ پھر وہ باری باری سے ہر عورت کو دیکھتے اور اس دوران میں اسی گرم جوشی سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند کرتے جس کا ثبوت انھوں نے ناچتے گاتے وقت دیا تھا۔ اِس معائنے کے بعد سب دُوسرے کمرے میں دوبارہ کھانے پینے کی نیت سے چلے جاتے تھے۔ اور آخرکار سب باتوں سے نچنت ہو کر وہ دادِ عیش کا ایسا پیرایہ اختیار کرتے جس کا بیان قلم سے ممکن نہیں۔

ان کی جسمانی وحشت میں تو خیر حیرت کی کوئی بات نہ تھی کیوں کہ سانڈ یا گھوڑے ان سے اس معاملے میں بڑھے ہوے ہیں۔ حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی تھی

کہ پل بھر پہلے جن عورتوں کے حُسن کو وہ عزّت کے قابل سمجھتے تھے اب انھیں روند کر عین خوشی حاصل کرتے تھے۔ ان کی شہوت پرستی انتقام کے اس جذبے کا پرتو تھا جو ماحول کی پابندیوں نے ان میں پیدا کر دیا تھا۔

ایسے ہی ایک موقع پر تخون کی چیخ سُن کر میرا دم سا نکل گیا۔ اس نے کسی آئینے میں اپنی شکل دیکھ لی تھی "دوستو! دیکھو۔ اللہ میرے گناہوں کو بخش دے!" اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور آنکھیں خوف کے مارے باہر نکل آئیں۔

"یہ انسان کا چہرہ نہیں —— لوگو، دیکھو۔"

ایک بوتل اٹھا کر اس نے دیوار پر دے ماری: "شیطان کہیں کے، یہ لے!" وہ نشے میں متوالا نہ تھا کیوں کہ جب پادری نے اسے بہلانے کی کوشش کی تو وہ سنجیدگی سے کہنے لگا: "رہنے بھی دو بابا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مَیں انسانوں کی سی زندگی بسر نہیں کرتا، بلکہ مَیں انسان ہی نہیں ہوں میرے سینے میں رُوح نہیں بلکہ شیطان کا بسیرا ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔"

عورتیں درد کے مارے چیخنے لگتی تھیں لیکن اس کرب کو وہ ناگزیر اور شاید نشاط آور تصوّر کرتی تھیں۔ گرافودا تو جان بُوجھ کر اسٹیشن ماسٹر کو چھیڑتی تھی: "رُک کیوں گئے —— ایک بار اور ——"

اس کی آنکھوں کی پُتلیاں اتنی پھیل جاتی تھیں گویا وہ ابھی جامِ شہادت پی لے گی۔ اور مجھے خوف لگا رہتا کہ کہیں اسٹیشن ماسٹر اسے درحقیقت مار نہ ڈالے۔

ایک مرتبہ اس محفل سے واپسی کے وقت جب پَو پھٹ چُکی تھی مَیں نے اس فاحشہ سے پُوچھا کہ وہ اس وحشی زور و جبر کو ہنسی خوشی برداشت کیوں کر لیتی ہے۔

جواب میں وہ بولی: " اصل دُکھ مجھے نہیں اُسے ہی ہوتا ہے۔ ان سب کا یہی حال ہے۔ پادری تو ہمارے گوشت میں دانت پیوست کرکے رونے لگتا ہے۔"

مَیں نے پوچھا: " اس کی وجہ کیا ہے؟ "

" پادری کو اس کا دُکھ ہے کہ بڑھاپے نے اس کے جسم کا رس چوس لیا۔ دوسروں کی اذیت پسندی کے اسباب تم نہ سمجھ سکوگے اور نہ مَیں تمھیں بتلاؤں گی۔ مَیں جانتی بہت کچھ ہوں لیکن اس کا اظہار نہیں کرسکتی۔ جب خیالات کو یک جا کرتی ہوں تو مناسب الفاظ نہیں ملتے اور الفاظ تلاش کرتی ہوں تو خیالات بکھر جاتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ جسمانی وحشت کے ایسے انوکھے تجربے ہوئے ہوں گے۔ اس نے رائے دی: " تمھاری حالت پر مجھے رحم آتا ہے۔ جیسے پرندہ آگ میں گِر کر بھُن جائے تم بھی اس گرد و غبار میں دب کر مر جاؤگے۔ تمھیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ "

اور ایسی دلیرانہ عقل مندی سے جو صرف انھیں ودیعت ہوتی ہے جنھیں روح کی تاریکی میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے، اس نے مجھے اپنی بے حُرمتی اور آوارگی کی الم ناک داستان سُنائی۔

اس زمانے میں مَیں انسانیت اور درندگی کی کش مکش کے نظارے میں مصروف تھا۔ انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی بہیمانہ خواہشات کی تسکین چاہتا ہے تاکہ ان سے نجات حاصل کرلے۔ لیکن خواہشات کی شدت انسان کو پابہ زنجیر کرکے اپنا غلام بنالیتی تھی۔

ان دنوں شہوت کے یہ شرم ناک نظارے مجھ میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کرتے تھے۔ بہ ایں ہمہ مردوں اور خصوصاً عورتوں کے حال پر ترس

بھی آتا تھا۔ اس کے باوجود ان محفلوں میں شرکت سے مَیں اپنے آپ کو روک نہ سکتا تھا کیوں کہ زندگی کے ہر رنگ کے دیکھنے کا خبط مجھ پر بُری طرح سوار تھا۔ خوکول کا وہ جُملہ ہمیشہ کانوں میں گونجا کرتا تھا: "سب کچھ جاننا سمجھنا چاہیے۔"

ایک بار خوکول نے کہا تھا: "بے معنی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہی۔ ہر کونے میں خواہ وہ کتنا ہی تاریک ہو جھانک کر دیکھو کہ اس میں کوئی ایسی چیز تو چھپی نہیں ہی جس کا عِلم ضروری ہی۔ دلیرانہ زندہ رہو اور اگر کوئی بدمزگی پیدا ہو تو بھاگ نہ جاؤ کیوں کہ ماحول اس لیے بدمزہ ہی کہ تم اس کے ہر پہلو کو نہیں سمجھتے۔"

لہٰذا مَیں تاریک ترین گوشوں کی چھان بین سے بھی نہ چوکتا تھا۔ اور اس طرح مَیں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ گو یہ عِلم میرے لیے تکلیف دہ تھا لیکن اس سے مَیں ان لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتا تھا جن کی زندگی میں نیکی و بدی کے اصولوں میں کش مکش جاری تھی۔

اس دنیا میں اگر کسی شے میں عظمت یا بزرگی کا شائبہ بھی ہو سکتا ہی تو وہ انسان کی ذات ہی۔ کیوں کہ اس میں اپنی اصلاح و ترقّی کا جوہر ہی۔ اور ایسے لمحات میں بھی جب مَیں انسان سے انتہائی نفرت کرتا تھا اس کی برتری سے انکار کرنا محال تھا۔

جب زندگی کے کھیل کے اصولوں کو جانچنے پرکھنے کا موقع مِلا تو مَیں نفرت کرنا بھول گیا۔ اس لیے نہیں کہ نفرت کرنا مشکل ہی بلکہ اس لیے کہ نفرت سے کچھ مِلتا نہیں بلکہ انسان اپنی گِرہ سے کچھ کھو آتا ہی۔

لیکن فلسفہ بھی دِل کا بہلاوا ہی ہی۔ اگر کسی کو دُنیا نے رنج و غم کے سوا کچھ نہ دیا ہو اور انسان کے ہاتھوں اسے آنسوؤں کے سوا کچھ نہ مِلا ہو تو

جی چاہے نہ چاہے فلسفے کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر تین چار ماہ گزارنے کے بعد جی بالکل اُچاٹ ہوگیا اور یہاں کی زندگی وبال ہوگئی۔ کیوں کہ مَیں اسٹیشن ماسٹر کی اندر سبھا سے بالکل بیزار ہوچکا تھا۔ علاوہ برایں اس کی باورچن نے میرا جینا اجیرن کردیا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر کی اور اونچائی میں چھ فیٹ سے زیادہ تھی۔ اور جب مال گودام کے ترازو پر اسے تولا گیا تو پلڑے نے تین من پر جاکر جواب دے دیا۔ اس کی بائیں آنکھ کے نیچے مسا نکل آیا تھا اور بھنوؤں کا تناؤ اس کی شک پسند طبیعت کو ظاہر کرتا تھا۔ خیر سے وہ پڑھی لکھی تھی اور شہیدوں کے حالات سے خاص دِل چسپی رکھتی تھی۔ رؤمہ کے بادشاہوں سے اسے انتہائی نفرت تھی اور وہ اکڑ کر کہتی کہ: اگر وہ کل منحے مجھے مِل جاتے تو مَیں ان کا منھ نوچ لیتی۔

ماضی کے سورماؤں کو تو وہ بُرا بھلا کہ لیتی لیکن پولیس کے داروغہ کو دیکھتے ہی اس کی ساری اکڑفوں ہوا ہوجاتی۔ رات کی محفلوں میں وہ لونڈیوں کی طرح مسلوف کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوجاتی اور اسے یوں تاکتی رہتی جیسے کوئی کُتیا اپنے مالک کے حُکم کی منتظر ہو۔ کبھی کبھی وہ جھوٹ موٹ واویلا مچاتا گویا حد سے زیادہ پی گیا ہے۔ فرش پر لیٹ کر وہ چلّانے لگتا "میرا دم نکل رہا ہے۔"

وہ گھبرا کر فوراً اسے گود میں اُٹھا کر باورچی خانے لے جاتی۔

گھبراہٹ میں وہ اس کا نام بھول جاتی تھی۔ اور جب وہ کچھ اناپ شناپ بکنے لگتی تو وہ اُچھل کر بیٹھ جاتا اور للکار کر کہتا:۔

"کیا کہا؟"

اب تو بی مرینا کی گھگھی بندھ جاتی اور گڑگڑا کر کہتی: "عیسیٰ کا واسطہ مجھے

معاف کردو۔"

اسے ڈرانے کے لیے مسلوف اور زور سے چیخنے لگتا۔ اور مرمینا مجرموں کی طرح خاموش کھڑی اپنی سبز آنکھوں سے آنسو ٹپکانے لگتی تھی۔ یہ تماشا دیکھ کر ہنستے ہنستے سب کا بُرا حال ہوجاتا تھا اور مسلوف اس کے پیٹ پر سر سے ٹکر مار کر کہتا:

"اب جاؤ آرام کرو۔"

جب وہ چلی جاتی تو مسلوف فخریہ کہتا:

"ہے تو بھینس مگر بڑی رحم دِل ہے۔"

پہلے پہل مرمینا مجھ سے مادرانہ شفقت سے پیش آتی تھی۔ ایک دِن میری جو شامت آئی تو مَیں پوچھ بیٹھا کہ نابکار مسلوف سے لونڈیوں کی طرح کیوں پیش آتی ہو۔ یہ سُن کر اسے ایسا صدمہ ہوا جیسے مَیں نے اس پر تتا پانی ڈال دیا ہو۔ سبز آنکھوں میں خون اُتر آیا اور غصے سے نڈھال ہوکر ایک مونڈھے پر گر پڑی اور جوش کے مارے اس کا بدن کانپنے لگا۔ ناگن کی طرح وہ پھنکار اُٹھی: "ذلیل کہیں کے! تجھے اتنی بڑی بات منھ سے نکالنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ مَیں تجھے اس گستاخی کا مزہ چکھادوں گی —— وہ تیری ہڈیاں توڑ دے گا۔ مَیں تجھے کولھوئیں پلوادوں گی۔ تو پاگل تو نہیں ہوگیا جو ایسے فرشتے پر حرف رکھتا ہے۔"

اور یک بہ یک وہ زور سے چلّا پڑی:۔

"تجھے تو قتل کردینا چاہیے، بھیڑیے کہیں کے! جا اپنا منھ کالا کر۔"

میری یہ حالت ہوئی گویا بھونچال آگیا۔ کم عمری کے باوجود مَیں بھانپ گیا کہ مَیں نے غلطی سے اس کی داخلی زندگی کے کسی ایسے تار کو جھنجھوڑ دیا جو

یا تو اس کے لیے مقدس ہو یا غم انگیز۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل تھا کہ چربی اور گوشت کے اس ہیولا میں بھی کوئی لطیف خیال پنپ سکتا ہو۔ اس کے بعد مَیں سمجھ گیا کہ ہر انسان کو ضرور سمجھنا چاہیے اور احترام و احتیاط کے ساتھ اس کے باطن کے قریب جانا چاہیے۔

اب تو یہ چڑیل مرمینا پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی اور اسٹیشن ماسٹر کے چولھے چکّی میں پھنسا کر اس نے میرا کچومر نکال دیا۔ رات بھر پہرا دینے کے بعد صبح لکڑی کاٹ کر تنور اور انگیٹھی میں آگ دہکانا میرے روزانہ فرائض میں شامل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس پیرِ مغاں کے گھوڑے کی رکھوالی بھی میرے ہی سپرد ہوگئی۔ اس طرح دوپہر ہو جاتی تھی اور نہ سونے کا وقت ملتا تھا نہ پڑھنے کا۔

یہ شیطان کی خالہ کھلّم کھلّا دھمکانے لگی کہ: "مَیں تجھے اتنا تنگ کروں گی کہ تو بھاگ کر کوہِ قاف میں دم لے گا۔"

یہ سن کر مجھے بری نوف کا جملہ یاد آیا کہ: 'انسان کو کوہِ قاف میں بھی زندہ رہنے کی عادت ڈالنی چاہیے'۔ جب کوئی بس نہ چلا تو مَیں نے ریلوے کے محکمے کو نظم میں درخواست لکھی جس میں مرمینا کے ظلم کی داستان بیان کی تھی۔ بارے یہ درخواست منظور ہوئی اور میرا تبادلہ ایک بڑے اسٹیشن کے دفترِ مال میں ہوگیا جہاں موم جامے اور بوریے کی صفائی اور دیکھ بھال میرے ذمّے ہوئی۔

وہاں کئی پڑھے لکھوں کی ایک ایسی جماعت سے میری ملاقات ہوگئی جو سب جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ ان سب کو مطالعے کا شوق تھا اور ان میں غیر ملکی زبانوں کے ماہر بھی تھے۔ جماعت کے ارکان کی تعداد لگ بھگ ساٹھ ہوگی۔ ریل گوداموں سے چوری کے حادثوں کے سدِّباب کا کام ان لوگوں نے

فی سبیل اللہ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ آج کل ان کی ساری توجہ اسی طرف
اور وہ ریلوے کے ملازموں کی بے ایمانی کی قلعی کھولنے میں مصروف تھے۔ میں
اکثر سوچتا کہ ان کی ذہانت اور دیانت کا کوئی بہتر استعمال ہونا چاہیے تھا
لیکن پھر یہ خیال آیا کہ روس میں ترقی یا اصلاح کا نام لینے والوں کی جگہ کا
پانی یا جیل کے سوا اور کوئی نہ تھی۔

قزاق چوروں کے دست برد سے شہتیروں اور بوریوں کی حفاظت کر
وقت زندگی کی شادمانی اور کام یابی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ان دنوں میں شیکسپ
اور ہائینے کے مطالعے میں محو رہتا تھا۔ اور راتوں کو جب یہ خیال آتا کہ حیات
انسانی بے کار ضائع ہورہی ہے تو گھنٹوں میرا دماغ معطل رہتا گویا کھوپری ڈنڈ
کی مار سے سُن ہوگئی ہے۔

شہر میں ہر طرف چربی، صابن اور سڑے ہوئے گوشت کی بدبو پھیلی
ہوئی تھی۔ کوتوال پادریوں کو گھر بلاتا کہ وہ کوئی وظیفہ پڑھ کر کنوئیں کے بھوت
کو نکال باہر کریں۔

اسکول ماسٹر ہر سنیچر کو اپنی بیوی کو غسل خانے میں بند کر کے پیٹتا تھا
کبھی وہ بھاگ کر ننگ دھڑنگ باغ میں آجاتی اور میاں قمچی لیے ہوئے
اس کے پیچھے لگ جاتا تھا۔ اس کے پڑوسی دوستوں کو بلا کر کھڑکی کی آڑ سے
یہ تماشا دکھلاتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو جاتا تھا۔

ایک بار میں کسی سے جھگڑ کر پولیس کی لپیٹ میں آگیا۔ کسی شہری نے
آوازہ کسا: "میاں جھگڑنے کی کیا بات تھی۔ ایسا تماشا دیکھنے کو کس کا جی
نہیں چاہتا۔ ماسکو میں بھی ایسی نمایش دیکھنے کو نہ ملے گی۔"

اسٹیشن کے ایک منشی سے میں نے روپیہ مہینہ کرائے پر کمرے کا

ایک کونا رہایش کے لیے لے لیا۔ وہ نہایت سنجیدگی سے مجھے سمجھانے لگا کہ یہودی صرف جعل ساز ہی نہیں بلکہ مخنث بھی ہوتے ہیں! میں اس کی ہنسی اُڑاتا رہا۔ انجام یہ ہوا کہ ایک رات کو وہ اپنی بیوی اور سالے کو لے کر یہ چھان بین کرنے آیا کہ میں خود ہی تو یہودی نہیں ہوں۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھے منشی کی کلائی اور سالے کا جبڑا توڑنا پڑا۔

پولیس کے داروغے کی باورچن انجن ڈرائیور کو جو کیک کھلاتی تھی اس میں اپنا خون بھی ملا دیتی تھی تاکہ وہ اس پر عاشق ہو جائے۔ اس کی سہیلی نے اس ٹوٹکے کا بھید کھول دیا۔ سُنتے ہی ڈرائیور بھاگا ہوا ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ پیٹ میں کہرام مچا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے بہت سمجھایا لیکن گھر آکر اس نے خودکشی کرلی۔

اس قسم کے واقعات میں اپنے انقلابی دوستوں کو سُنایا کرتا تھا لیکن انھیں ہرگز یقین نہ آتا اور ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔ میں ان خرافات کے اسباب معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن ان پر کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ بلکہ میرے دوست کہہ دیتے کہ "ایسے لوگوں سے کوئی تعلق نہ رکھو۔ ان کی برائیوں کی وجہ چربی کی وہ تہ ہے جو ان پر چڑھی ہوئی ہے"

یہ سچ ہے کہ اس طبقے کے لوگ کھانے کے لیے ہی جیتے تھے۔ کسی غیرِ متوقع قحط کے خوف سے پیٹ میں بھانت بھانت کے کھانوں کے انبار لگا لیتے تھے لیکن ان کا وجود ماحول کو تنگ و تاریک بنا دیتا تھا۔

پڑھے لکھوں میں جو شریف و نیک تھے ان کی بھی زندگی مجھے بے رنگ معلوم ہوتی تھی۔ محنت و مشقت میں وحشت و ہنگامے نے جو یک رنگی کا پہلو پیدا کر دیا تھا ان کے شب و روز اس سے مختلف سہی

مگر اسے قریب سے دیکھ کر میری رُوح میں اُلجھن سی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس
پچھلے شہر کی عامیانہ زندگی سے یہ لوگ قطعاً بے تعلق تھے اور سب انھ
اجنبی سمجھتے تھے۔ شہر والے ان کے خیالات کی نہ پروا کرتے تھے نہ کو
دِل چسپی لیتے تھے۔

شام کی صحبتوں میں یہ ادیب اور عالم اشاروں میں بعض
رُوکھی پھیکی عورتوں کو پرچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان پھیکے شلجموں
میں دو بہنیں تھیں جنھیں دیکھتے ہی چمگادڑوں کا خیال آتا تھا۔ ایک لنگ
جو کبھی جہازی افسر تھا، ذوق و شوق سے 'محبت کے فلسفے' اور 'جذبۂ شہوت ک
تہذیب' پر دھنواں دھار تقریر کیا کرتا تھا۔ ان موقعوں پر دونوں چمگادڑیں
آنکھیں جھکا کر، ٹانگیں سُکیڑ کر اور دامن سمیٹ کر یوں بیٹھ جاتیں گویا انھیں ڈ
ہو کہ کہیں لفاظی کا یہ طوفان انھیں اُڑا نہ لے جائے۔

چند روز بعد اس عاشقِ لنگ کو چمگادڑوں کے بھائی نے یہ خط لکھ بھیجا
"جنابِ من: اگر آپ میری بہنوں کی موجودگی میں محبت کا فلسفہ بگھارنا بند
نہ کردیں گے تو میں سب سے پہلے آپ کا سر توڑ دوں گا پھر پولیس میں آپ
کی رپٹ کروں گا۔"

ان صحبتوں میں مجھے اسٹیشن ماسٹر کی محفلیں یاد آتیں جہاں جذبات
اپنی تمام وحشت پسندی اور برہنگی کے ساتھ منظرِ عام پر آتے تھے اور محبت
کی عشوہ گری کا پردہ فاش کرتے تھے۔ وہ لوگ جو شرابی، جواری اور چور تھے
حال و قال کے بعد مقام پر جا پہنچتے۔ لیکن عالموں اور ادیبوں کو دل کا حال
کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور وہ منافقت کی نقاب کو زیادہ پسند کرتے تھے۔
مجھ میں نہ اتنا علم تھا نہ اتنا تخیل کہ ان متضاد دنیاؤں کا تجزیہ کرسکوں

اور بتلاسکوں کہ ان کے درمیان اتنی بڑی دیوار کیوں کھڑی ہوئی ہے۔

آج تیس سال بعد بھی عامیوں اور عالموں کے دونوں گروہ صاف صاف میری آنکھوں کے آگے آجاتے ہیں۔ لیکن ہنوز میں اپنے میں طاقت نہیں پاتا کہ ان عینک باز کتاب کے کیڑوں کا حلیہ کھینچ سکوں جو کرائے کے کپڑے پہن کر سفید پوشوں میں اپنے نام ٹنکواتے تھے۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ میں علم و ادب کی ان قباؤں کا جائزہ لے سکوں جسے یہ اوڑھے رہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ عامی سیدھے سادے ہوتے ہیں اور ان کا بیان آسان ہے اور پڑھے لکھے اپنے عیب و حسن پر تمدن کا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ بات نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ دونوں گروہوں میں بنیادی فرق ہے اور وہ ماحولی نہیں بلکہ فطری ہے۔

میرے دریچے کے باہر اندھیرا گھپ تھا جس کی اُداسی کو اسٹیشن کی روشنی کچھ کم کردیتی تھی۔ ریل گاڑیاں سرخ چشم اژدہوں کی طرح ہانپتی پھنکارتی آتی جاتی رہتی تھیں۔ قلی اور مزدور لالٹینیں ہلاتے ہوئے یہاں وہاں پھرتے رہتے تھے دریچے کے شیشوں پر دھوئیں اور بھاپ کے بادل ٹکراتے تھے۔ انجن جب سیٹی بجاتے تو شیشے میں سے ہلکی سی چیخ نکلتی تھی۔ اس کمرے میں حسن کو زیر کرنے کی جو خواہش تلملا رہی تھی اس کا اس زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا جو شب کی تاریکی میں محنت کے بار سے نڈھال ہوگئی تھی۔

ایک طرف جذبات کی متواتر مگر بے مقصد فراوانی تھی۔ دوسری طرف عقل کی کش مکش تھی جو پرشکستہ پرندے کی طرح زندگی کے تنگ آشیانے میں قید تھی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید روس کے سوا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں تخلیقی قوتوں میں اتنا بڑا نفاق دیکھنے میں نہ آئے گا۔ جب کبھی میں اسٹیشن ماسٹر کی رنگ رلیوں کا ذکر کرتا تو یہ احساس ہوتا کہ کئی پڑھے لکھے دل ہی دل میں ان

درندوں پر رشک کر رہے ہیں۔ انھیں وہ دِل سے بُرا نہیں سمجھتے تھے بلکہ صِرف اس لیے کہ ظاہرداری کا یہی تقاضا تھا۔ ان میں سے صرف ایک نے جس کا نام بزنوف تھا، کہا :۔

"اگر مَیں ایسی محفلوں میں شریک ہوں تو ویسے ہی فنا ہو جاؤں جیسے دَل دَل میں پھنس کر کوئی جانور۔ کیوں کہ دَل دَل سے نکلنے کی جتنی کوشش کی جائے اس میں اتنا ہی پھنستے جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں آگیا کہ تم جیسے لوگ ان کی طرف کیوں کھنچ کر جاتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی بے جان ہے لیکن وہاں مسلسل حرکت ہے، ہل چل ہے۔ اور تم جس اسٹیشن ماسٹر کا ذِکر کرتے ہو اس کا محکمے میں بڑا عمل دخل ہے۔ حال ہی میں اس کے گھر کی تلاشی کسی چوری کے سلسلے میں ہوئی تو اس نے ایک کاغذ نکال کر دیا کہ مَیں نے آج تک جو کچھ چُرایا ہے یہ اُس کی فہرست ہے۔"

بزنوف تھوڑی دیر خاموش کچھ سوچتا رہا پھر بولا :۔

"مَیں سچ کہتا ہوں کہ اس قسم کا اعتراف کوئی رُوسی ہی کر سکتا۔ غالباً ہماری قوم اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ تضاد میں یگانگت پیدا کرے۔ ہم محبت میں ظُلم کرتے ہیں اور مسرت کے وقت ہماری وحشت اُبھرتی ہے۔"

کُرسی سے اُٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے اس نے کہا :۔

"جو بھی ہو روسیوں کی قوم کی آن بان نرالی ہے ——— اسی لیے ان سے زیادہ غم گین دُنیا میں اور کوئی نہیں۔"

بزنوف ان چند لوگوں میں سے تھا جنھوں نے مجھ میں عزّت اور ہم دردی کے جذبات پیدا کیے۔ اس کے سر پر بالوں کی اتنی بہتات تھی کہ کہ دھوکا ہوتا تھا کوئی پادری نہ ہو۔ وہ پہلوانوں کی طرح قدم تول تول کر رکھتا

تھا جس کی وجہ سے۔ اس کے ڈیل ڈول میں ایسا وقار پیدا ہوگیا تھا جو پڑھنے لکھنے والوں میں نایاب ہوتا ہو۔ اس کی آواز میں بڑا رس تھا لیکن موسیقی سے اسے زرا بھی دل چسپی نہ تھی بلکہ وہ اس فنِ شریف کا مخالف تھا۔

اس کی آدھ کھلی آنکھوں میں شرافت گھُلی ہوئی تھی اور وہ ہر ایک کو ایک خاص رحیمانہ انداز سے دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ مجھے عیسوی تحریک کی اٹھان کے واقعات سُنایا کرتا اور اوّلیں فرقوں کا ذِکر کرتے وقت بڑے جوش میں آجاتا تھا باتیں کرتے وقت وہ پنجے کے بل کمرے میں ٹہلنے لگتا تھا۔ دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں اور کسی لفظ کی اہمیت جتانے کے لیے سر کی جنبش۔ لیکن کبھی کبھی کوئی بات کہتے کہتے یک بہ یک چُپ ہوجاتا اور دیر تک کسی خیال میں محو رہتا۔ ڈاڑھی کے بالوں کو ہونٹوں سے بھینچتے ہوے وہ ایک انگلی سے ماتھا کھجانے لگتا تھا۔ ایک بار مَیں نے ٹوک کر پوُچھا کہ آپ کس فِکر میں کھوے گئے۔

جواب مِلا: "اوفوہ! کتنی ذہانت بے کار ضائع ہورہی ہو — ایسی ذہانت جو دُنیا میں کایاپلٹ کرسکتی ہو۔"

عقل کی طاقت کو وہ اکثر سراہا کرتا تھا:۔

"بھائی، ہر مسئلے کو عقل سے حل کیا جاسکتا ہو۔ عقل کو ہر راز کی چابی سمجھو۔"

مجھے اس سے بڑا لگاؤ تھا اور اس کی ہر بات ماننے کو جی چاہتا تھا۔

ایک دِن میدان میں لیٹے لیٹے مَیں نے اسے وہ بات سُنائی جو پولیس مین نِک فورچ نے رحم وکرم اور طالس طائی کے چیلے نے ڈارون کے متعلق کہی تھی۔ غور سے میری باتیں سُننے کے بعد اس نے جواب دیا: "ڈارون کا نظریہ حقیقت پر ہی مبنی کیوں نہ ہو مَیں اسے پسند نہیں کرتا ویسے ہی جیسے جہنم

کوئی پسندیدہ حقیقت نہیں ہوسکتی۔ مشین کے متعلق تو یہ سچ ہی کہ اس کے پُرزوں میں جتنی ہم آہنگی ہو اتنا ہی اچھا ہی۔ مگر زندگی کا معاملہ برعکس ہی۔ یہاں ارتقا کے لیے کش مکش کی بڑی ضرورت ہی۔ اسی سے رواداری پیدا ہوتی ہی انصاف کا دار و مدار رواداری پر ہی۔ رازِ حیات سکون میں نہیں کش مکش میں مضمر ہی۔ اور جب جنگ کی ٹھیری تو پھر رحم و کرم سے کیا غرض۔ لہٰذا وہ پولیس مین نامعقول نہ تھا۔"

دیر تک سوچنے کے بعد بزنوف اُچھل کر اُٹھ بیٹھا، پہلے سگریٹ جلایا پھر اسے پھینک دیا اور اُداسی کے لہجے میں کہنے لگا:۔

"میرا خیال ہی کہ دو ہزار سال بعد انسانوں کو انسانیت کی یاد آئی ہی۔ بہت دیر ہوگئی —— اچھا، اب مجھے شہر جانا ہی —— جی چاہے تو تم بھی آؤ۔"

چند ماہ بعد میرا تبادلہ کہیں اور ہوگیا اور وہاں مجھے اطلاع ملی کہ بزنوف نے سینے میں گولی مارکر اپنا خاتمہ کرلیا۔ اس کی جیب میں جو پرچہ تھا اس میں ایک دوست کے نام وصیت تھی کہ میری کتابوں کو فلاں فلاں احباب میں تقسیم کردو۔ ان میں میرا نام بھی تھا۔

یہ خط پڑھ کر مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ ایسے تن درست اور صحیح الدماغ آدمی سے موت کو دُور کا بھی واسطہ نہ ہونا چاہیے تھا۔ مَیں سوچتا رہ گیا کہ اس خودکشی کی وجہ کیا ہوسکتی ہی۔

یاد آیا کہ ایک بار ہم دونوں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ اس نے نشے کی حالت میں پُوچھا کہ جانتے ہو، دنیا کا سب سے اچھا گیت کون سا ہی۔

اس نے مغموم لہجے میں فرانسیسی زبان کا ایک معصوم سا گیت سُنایا جس

میں بچپن کا نوحہ تھا اور گاتے گاتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں مطلق نہ سمجھ سکا کہ ان سیدھے سادے الفاظ میں دل کو تڑپا دینے والی کیا بات ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد کئی مرتبہ میں نے ذرا سے جھٹکے سے دل کے تاروں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔

زندگی کی درس گاہ میں میں نے جو سبق پڑھا وہ تلخ سہی لیکن کارآمد ضرور تھا۔ اسی زمانے میں میں ایک ایسے الم ناک واقعے سے دوچار ہوا جس کا اثر ایک عمر تک رہا۔

ایک روز میں ماسکو کے کسی چھوٹے سے بھٹیار خانے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ میرے عین مقابل ایک دراز قد مگر نحیف جسم آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ آنکھوں پر عینک، ٹھوڑی پر نکیلی ڈاڑھی اور لبوں پر چھوٹی سی مونچھ۔ نیلا کوٹ جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں کسی اور کا ہوں اور تنگ سی پتلون پنڈلیوں پر منڈھی ہوئی۔ ایک پیر میں ربر کا گالوش اور دوسرے میں پھٹا ہوا چمڑے کا جوتا۔ دیر تک مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وہ مجھے گھورتا رہا، پھر چشمہ اتار کر لڑکھڑاتے ہوئے میرے قریب آیا اور ہاتھ پھیلا کر بولا :۔

"میں ہوں وکیل گلیڈکوف"!

میلی انگلیوں سے ہوا میں ایک لکیر کھینچ کر اس نے معنی خیز لہجے میں دہرایا :۔

"الکسی گلیڈکوف"

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ اپنی گردن کو یوں گھما رہا تھا گویا وہ کسی شکنجے میں جکڑی ہوئی ہو

تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا کہ وہ بڑا بھلا مانس تھا۔ سچائی کی خاطر

اسے بڑے مصائب جھیلنے پڑے تھے اور دشمنوں نے اسے سماج سے باہر نکال پھینکا تھا۔ ان دِنوں وہ ناٹک والوں کے پارٹ نقل کرکے پیٹ پالتا تھا۔ باقی وقت ظلم سے لڑنے یا ان سیٹھانیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں گزارتا تھا جو اللہ کے نام پر غریبوں کی محافظ بن گئی تھیں۔

وہ کہا کرتا تھا کہ: "رُوسی مرد عموماً اور رُوسی عورتیں بالخصوص غم کو پسند کرتی ہیں۔ چربی کی تہوں میں جو دِل چھپا ہوا ہو وہاں تک پہنچنے کے لیے غم کے نشتر کی ضرورت ہو۔"

اس ڈھب کے کئی آدمیوں کو مَیں دیکھ چُکا تھا۔ اس لیے ان سے ہزار دِل چسپی ہونے کے باوجود مَیں اپنا دامن بچاتا تھا۔ جو آدمی اوپر چڑھ رہا ہو وہ فطرتاً پلٹ کر ان لوگوں کو دیکھتا ہو جو نیچے گِر پڑے ہوں۔ اور قعرِ پستی میں گِرنے والوں کو خواہ گناہ گار کیوں نہ سمجھا جائے لیکن ان کی رُوحانی زندگی یقیناً ان سے بہتر ہوتی ہو جو خدا ترس کہے جاتے ہیں اور جنھیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ عجائب گھر میں رکھی ہوئی موم کی مُورتیں یاد آتی تھیں۔

اس ملاقات کے دو گھنٹے بعد مَیں گلیڈکوف کے ساتھ ایک محتاج خانے کے لکڑی کے تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا بانس جیسا بدن لمبا لمبا پڑا ہوا تھا اور ڈاڑھی شیطان کی دُم کی طرح اکڑی ہوئی، جو ہر کھانسی پر ہلتی جاتی تھی۔ وہ زہر بھرے الفاظ سے مجھے روحانی تسکین دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بے محل غصّے پر مجھے ترس آیا اور حیرت ہوئی کہ وہ سیہہ کے کانٹوں کی مانند اپنے اردگرد تند و تلخ اقوال کا جال کیوں بُن رہا ہو۔

کال کوٹھری کی چھت پر پرندوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے، دیواروں سے نمی کی بُو آرہی تھی۔ سڑتی ہوئی زمین پر کئی بے گھرے گُدڑیوں میں لپٹے خراٹے

بھرتے اور خواب دیکھ رہے تھے ۔ کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی دوسری طرف کوئی بِلّا بیٹھا بُری طرح رو رہا تھا ۔ ہو نہ ہو یہ منحوس بیمار ہوگا ۔ کھڑکی تلے ایک تختے پر ایک آدمی جو مُٹاپے میں احدیوں کو مات کرتا تھا پالتھی مارے موم بتّی کی روشنی میں پائجاموں کی مرمّت کرتا ہوا بیٹھی ہوئی آواز میں گنگنا رہا تھا ؎

" مادرِ عیسیٰ رحمت تجھ پر

تیرے سب ہیں غلام

ایک بار اس بھجن کو گاکر اس نے زور سے چٹخارا بھرا اور دوبارہ یہی الاپ شروع کردی ۔

گلیڈکوف نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا : " اس کا نام ہیمن ہو۔ کیمیاگری میں اسے کمال حاصل ہو ۔" اس ڈربے میں اور بھی کئی باکمال چھپے ہوئے تھے جن میں موسیقی کا ایک ماہر بھی تھا جس نے بعد میں بڑا نام پیدا کیا ۔

میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ یہ حضرت ' انجمنِ آبِ حیات ' کے کرتا دھرتا بھی تھے ۔ چناں چہ صبح سویرے فرمایا : " ہم اسی وقت اپنی انجمن میں ایک نئے مرکن کو داخل کریں گے ۔ یہ رسم ایسی عجیب وغریب ہوگی کہ تم بھی دنگ رہ جاؤگے "

اس نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا جس کے جسم پر قمیص تو تھی لیکن پتلون ندارد تھی ۔ وہ پُرانا شراب خوار ہوگا ۔ کیوں کہ اس کی نگاہوں میں مُردہ پن سا آگیا تھا اور نیلی پتلیاں آنکھوں کی گلابی مائل سفیدی میں گُھل مل گئی تھیں ۔

وہ ایک تختے پر بیٹھا ہوا تھا اور کیمیاگر اس کے گالوں پر سُرخی اور لبوں پر سیاہی مَل رہا تھا ۔

نوجوان لگاتار چلّا رہا تھا: "خدا کا واسطہ مجھے دِق نہ کرو۔"

گلیڈکوف نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا: "یہ ایک سوداگر زادہ ہے۔ مہینے بھر سے ہمارے ساتھ شراب پیتا پڑا ہے۔ جب دام ختم ہوگئے تو کپڑے لتے تک بیچ ڈالے ———"

ایک گول مٹول عورت جس کی ناک کی ہڈّی یا تو ٹوٹ گئی تھی یا کبھی تھی ہی نہیں، چٹائیاں لیے ہوئے اندر داخل ہوئی اور انھیں تختے پر پٹک کر پکارا:۔

"لباس تیار ہے۔"

گلیڈکوف نے حکم دیا: "کپڑے بدل ڈالو۔"

اندھیری کوٹھری میں پانچ آدمی بھوتوں کی طرح چلنے پھرنے لگے اور گویا کچھ کوئلوں میں آگ دہکانے کا جتن کرنے لگا۔ پھر کوٹھری کے بیچوں بیچ ایک تختہ رکھ دیا گیا۔ کیمیاگر نے چٹائی کا لہنگا پہن کر چٹائی کی ٹوپی سر پر رکھ لی۔ گلیڈکوف نے پادری کا بہروپ اختیار کیا۔ اس کے بعد چار آدمیوں نے نوجوان کے ہاتھ پانو پکڑ لیے اور اسے زبردستی تختے پر پٹک دیا۔

وکیل گلیڈکوف نے دہکتی ہوئی انگیٹھی کو نوجوان کے قریب لاکر پوچھا: "گانے والے تیار ہیں؟" انگیٹھی کے اندر کوئلے دہک رہے تھے اور اس میں سے جو دھنواں نکل رہا تھا وہ دم گھونٹنے کے لیے کافی تھا۔ نوجوان نے کھانستے کھانستے آنکھیں بند کرلیں، اور مجبوری کی حالت میں تختے پر تڑنے پٹکنے لگا۔

چٹائی کے چوغے میں گلیڈکوف کوئی مہیب دیو معلوم ہو رہا تھا اور اپنی ہیبت بڑھانے کے لیے وہ کبھی گردن جھٹکتا تھا، کبھی منھ بناتا تھا اور کبھی سر ہلاتا تھا۔

اب کیمیاگر نے نوجوان کی پائینتی کھڑے ہوکر کہنا شروع کیا:

"بھائیو، شیطان سے دعا مانگو کہ اس بابل کے باشندے کو اپنے دامنِ رحمت میں لے لے جو مے نوشی اور عیش کوشی کا بندہ بن چکا ہو۔ شیطان اس کی عزت آبرو کا نگہبان ہو اور اسے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں جگہ دے!"

تختے کے دائیں بازو جو پانچ بھوت کھڑے ہوئے تھے انھوں نے ایک فحش گیت شروع کیا اور گنبد میں گونج کر ان کی آوازیں زیادہ بھیانک ہوگئیں۔ موسیقی کا اُستاد ادا آموز بن کر ہاتھوں کے خوب صورت اشاروں سے ان کی قیادت کرنے لگا۔

کسی قسم کی بے شرمی سے مجھے حیرت نہ ہوتی کیوں کہ ایسے بہت سے تماشے دیکھنے میں آچکے تھے۔ لیکن یہ گیت اس قدر فحش اور گندہ تھا اور اس کے ساتھ ایسے نادیدہ تاؤ بھاؤ دکھائے جارہے تھے کہ دراصل یہ کسی شیطان کی ہی اختراع ہوسکتی تھی۔ آج تک میں نے ایسی مہذب فحش گوئی نہیں سُنی جس کی پچکاری ان پانچ گلوں سے نکل کر تختے پر پڑے ہوئے بے بس نوجوان پر گر رہی تھی۔ اس رسم کی ادائی میں وہ جوش کا نہیں بلکہ ایک قسم کی مجبوری کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ وہ تفریح کی خاطر نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک رسم ادا کر رہے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ اس رسم کی ادائی میں پورے مشاق تھے کیوں کہ یہ اتنی ہی منجھی ہوئی تھی جتنی گرجا گھر کی عبادت۔

میں اپنے جذبات کو بہ مشکل ضبط کرسکا۔ دم سادھے ہوئے ڈھیڈ کوف کی اچھوتی گالیوں اور اس فحش گیت کو سُنتا رہا۔ مجھ سے اس بدنصیب کی طرف دیکھا بھی نہیں گیا جس کی زندہ لاش پر فاتحہ خوانی کی یہ رسم ادا کی جارہی تھی۔ اس کے ہاتھ سینے پر پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹ ہل رہے تھے اور

کبھی کبھی وہ دھیمی آواز میں کچھ کہ اُٹھتا تھا۔ اس کی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور لبوں پر ایک احمقانہ تبسّم تھا۔ اگر اس کے جسم میں یک بہ یک لرزہ ہوتا اور وہ خوف سے چیخ کر تختے سے کودنے کی کوشش کرتا تو سب لوگ اس کے ہاتھ پانو باندھ لیتے تھے۔

یہ رسم اتنی بے ہودہ اور نفرت انگیز معلوم نہ ہوتی اگر یہ خبیث اسے تفریح سمجھتے اور کبھی بھوٹے منھ ہنس دیتے۔ خواہ یہ ان لوگوں کی مایوسانہ یا تلخ ہنسی ہی کیوں نہ ہوتی جن کا کوئی مستقبل نہیں اور جنھیں زندگی کی صعوبتوں نے ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دیا ہو۔ لیکن غضب تو یہ ہو کہ ان میں قاتلانہ سنجیدگی تھی اور ان کا رویّہ اُن محبت پرست پجاریوں کا سا تھا جو اپنے خوں خوار دیوتا پر آدمی کی قربانی چڑھا رہے ہوں۔

ایسا محسوس ہوا کہ مَیں کسی بہت بڑے بار کے نیچے دبا جا رہا ہوں اور یہ بار مجھے کسی ایسے دل دل میں غرق کر دے گا جہاں سے نجات ناممکن ہو۔ گمان ہوا کہ یہ میری فاتحہ پڑھی جا رہی ہو۔ عجیب بات ہو کہ آپ ہی آپ میرے ہونٹوں پر بھی ایک احمقانہ مسکراہٹ آگئی۔

موسیقی داں کی چیخ پکار سے مَیں خاص طور پر برہم ہوا۔ وہ آنکھیں بند کر کے یوں گلا پھاڑ رہا تھا جیسے کوئی اسے ذبح کر رہا ہو۔ اس کی بلند آہنگی ان ذلیل فحش الفاظ کے مطالب کو بالکل بے نقاب کر دیتی تھی۔ ایک بار تو مَیں بھی درندوں کی طرح چلّا اُٹھنے کی خواہش میں مبتلا ہو گیا۔

انگیٹھی کو زور سے ہلا کر گلیڈکوف نے للکار بتائی:۔

"تابوت لاؤ"

اور گویا دانتے کے جہنّم سے یہ صدا بلند ہوئی:۔

بھُوتو ناچو مُردو جاگو

گرم ہواؤ دوڑو

آگ لگاؤ کفن بھی لاؤ

کافر کو دفناؤ !

اور اسی وقت وہ عورت دوبارہ کمرے میں نمُودار ہوئی۔

کیمیاگر نے ایک فحش اشارے سے اس کا خیر مقدم کیا اُور گلیڈکوف نے بھی یہی حرکت کی۔عورت نے چند گالیوں میں سلام کا جواب دے کر انھیں باری باری سے پیار کیا۔پھر سب نے ٹانگیں پکڑ کر اسے اُٹھایا اور مصیبت کے مارے نوجوان کے آغوش میں لٹا دیا۔ وہ بہت چلّایا اور تڑپا لیکن سب نے اسے جکڑلیا۔عورت اس پر اوندھی پڑگئی اور اسی وقت اس فحش گیت نے ایسا پلٹا کھایا جس میں ناچ کی گت نکلتی تھی۔

اب تو میرے ضبط کی انتہا ہوگئی۔ مَیں غصّے سے پاگل ہوگیا اور مَیں نے ان پاگلوں کو اندھا دھند پیٹنا شرُوع کردیا۔

. . . شام کے وقت جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو ریل کی پٹڑی کے پاس شہتیروں کے انبار میں پڑا ہوُا پایا۔کُچلی ہوئی اُنگلیوں سے لہُو بہ رہا تھا اور بائیں آنکھ سوجن کی وجہ سے بند ہوگئی تھی۔آسمان زمین کی طرح گردآلوُد ہوگیا تھا اور اس سے پسینے کی بوُندیں ٹپک رہی تھیں۔گھاس کے تیکے تنکوں سے منھ اور ہاتھوں کو پونچھ کر مَیں صبح کے واقعات کی یاد تازہ کرنے لگا۔

ان دنوں مَیں بڑا تن دُرست تھا اور میری جسمانی وحشت بے اندازہ تھی۔ من بھر وزنی مُگدر گھمالینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور مَیں پانچ من وزنی آٹے کی بوری اُٹھاکر چل سکتا تھا۔لیکن اس وقت جسم کی طاقت کافور ہوگئی تھی اور محسُوس

ہوتا تھا کہ جان نکل گئی ہے۔ روحانی توہین کی شدّت سے جی چاہا کہ چیخ چیخ کر رونے لگوں۔ کتابوں میں زندگی کے جس حُسن کا ذکر ہوتا ہے اس سے محظوظ ہونے کو مَیں ترستا تھا۔ مَیں کسی ایسی شے کی تمنا کرتا تھا جو مجھ میں طاقت اور مسرت پیدا کرے۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ مَیں بھی حیات کی شادمانیوں سے لُطف اندوز ہوں۔ کیوں کہ اب یک بارگی میرے سینے میں غصّے کا بھونچال اُٹھنے لگا تھا۔ جو عقل و دانائی کے تقاضوں کو کچل کر انسانوں سے میری گہری دِل چسپی کو حقارت و نفرت میں تبدیل کردیتا تھا۔

مجھے اس خیال سے بڑا دُکھ ہوتا تھا کہ زندگی کے ایسے گھنونے اور بھیانک پہلوؤں سے دوچار ہونے کے لیے مَیں کیوں مجبور ہوتا ہوں۔

محتاج خانے کی اس فحش رسم کا تصوّر عبرت ناک تھا۔ میرے کانوں میں گلیڈکوف کی ہیبت ناک چیخ 'تابوت لاؤ' گونج رہی تھی اور آنکھوں کے آگے اس عورت کا سڑا ہوا جسم گھوم رہا تھا جو دراصل شہوت کا سڑا ہوا مجسمہ تھا اور اپنے ہیولا میں ایک زندہ انسان کو فنا کردینا چاہتا تھا۔

جب مَیں نے اس کا مقابلہ اسٹیشن ماسٹر کی رنگ رلیوں سے کیا تو یقین ہوگیا کہ وہ تن درست درندوں کی عریاں شہوت کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ اُن میں اس روحانی دیوانگی کا انداز نہ تھا جو ہر حسین شے کو فنا کردینا چاہتی تھیں۔

نیم وحشی انسان حُسن کی پرستش میں گاہے گاہے آپے سے باہر

ہوجاتے ہیں۔ لیکن ہوش کے وقت وہ سمجھتے ہیں کہ یہ گناہ ہے۔ روحانی آزادی کی لاحاصل تلاش میں وہ بے قابو ہوجاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ جسم کی بھوک مٹانے کے لیے روح کو بھول جانا ضروری ہے۔

لیکن یہاں تو گویا نامردی نے اس حیات افروز جبلت کو مٹانے کا تہیہ کرلیا تھا جو اس خراب آباد دنیا میں زندگی کی تنہا ضامن تھی۔ اور یہی جبلت دنیا کے سارے حسن کی خالق ہے۔ یہ دیوانے زندگی کی جڑ کو کاٹ رہے تھے اور اپنے مریض تخیل کے زہر سے حسن کو یک سر فنا کردینا چاہتے تھے۔ جب انسان اتنی گہری روحانی کھائی میں گر پڑے تو وہ کس قسم کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔

تیسرا باب
میری پہلی محبّت

اب قسمت نے تعلیم کی تکمیل کے لیے مجھے پہلی محبت کارا
دکھایا جس میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی بچھے ہوتے ہیں۔

چند احباب نے دریائے اوکا میں کشتی رانی کا تہیہ کیا۔ اور مجھ
کہا کہ —— صاحب اور ان کی بیگم کو جلسے میں شرکت کی دعوت د
آؤ۔ یہ دونوں حال ہی میں فرانس سے لوٹے تھے اور اب تک
مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ چناں چہ ایک رو
شام کو میں ان سے ملنے گیا۔

وہ دونوں ایک پُرانے مکان کے تہ خانے میں رہتے تھے۔ اس
کے مقابل سڑک کا جو حصّہ تھا اس میں پانی جمع ہوجاتا تھا اور بہا
اور گرمیوں میں سوکھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ پانی کے اس کُنڈ سے کوّ
اور کتّے آئینے کا اور سؤور غسل خانے کا کام لیتے تھے۔

اس وقت میں کسی خیال میں ایسا محو تھا کہ بے خیالی میں
دندناتے ہوئے ان کے کمرے میں گھس پڑا۔ میری آمد نے ویسا ہی
تہلکہ برپا کیا جیسا اچانک پتھر سر پر لگ جانے سے ہوتا ہے۔ میرے

گے ادھیڑ عمر کا ایک موٹا تازہ آدمی کھڑا ہوا، اس کے چہرے پر بھوری اڑھی لہلہا رہی تھی اور نیلی آنکھوں کی چتون میں ہم دردی کا جذبہ تیر رہا تھا۔ دوسرے کمرے کے دروازے کو روک کر اور اپنے کپڑوں کو سنبھالتے ہوے اس نے تیکھے پن سے کہا:۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" پھر ناصحانہ انداز میں ——"کسی کے گھر میں گھسنے سے پہلے دروازے پر دستک دینا چاہیے"

دوسرے کمرے میں دھندلکا سا تھا اور اس میں سفید پرندے کی سی کوئی چیز پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہاں سے ایک سُریلی آواز آئی:۔

"خصوصاً اگر شادی شدہ لوگوں سے ملنے آئیں تو دستک دینا کبھی نہ بھولیں۔"

میں نے جھنجھلا کر پوچھا کہ آپ فلاں صاحب ہیں۔ مرد نے جو کوئی بنیا یا لالہ معلوم ہوتا تھا اقرار کیا تو میں نے اپنی آمد کی وجہ کہہ سُنائی۔

غور و فکر کے عالم میں ڈاڑھی کو سہلاتے ہوے اس نے پوچھا:۔

"ہو نہ ہو تمھیں کلارک نے بھیجا ہے"

اور اسی وقت چرخی کی طرح وہ یوں چکرایا گویا کسی نے چٹکی بھری ہو اور درد کے مارے پکار اٹھا:۔

"اولگا، اولگا!"

اس کے ہاتھوں میں جو لرزش ہوئی اس سے یہ بدگمانی ہوسکتی تھی کہ اس کی جسم کے اس حصے میں لی گئی ہے جس کا ذکر محض اس لیے معیوب سمجھا جاتا ہے کہ اس کا محلِ وقوع کمر کے جنوب میں ہے!

دروازے کی چوکھٹ پر ایک نازنین آکھڑی ہوئی اور مسکراتی

ہوئی نیلی آنکھوں سے میرا جائزہ لینے لگی :۔

"تم کون ہو؟ پولیس مین؟

"جی نہیں۔ شاید اس پتلون کی وجہ سے آپ کو بدگمانی ہوئی"

یہ سُن کر وہ کھِل کھلاکر ہنس پڑی۔

یہ ہنسی مجھے بھلی لگی کیوں کہ اس کی آنکھوں میں وہ تبسم تھا کا انتظار میں مدّتوں سے کر رہا تھا۔ اسے میرے لباس پر ہنسی آئی اس وقت میں پولیس کی نیلی پتلون پر خان ساماں کا سفید کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کوٹ کے بٹن گلے تک بند ہوجاتے تھے اس قمیص کی ضرورت ہی نہ رہتی تھی۔ پانو میں مانگے کے شکاری بوٹ اور سر پر چوڑے کنارے کا اطالوی ٹوپ۔ اس رنگا رنگ لباس نرالے پن کے کیا کہنے تھے۔

وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے کے اندر لے گئی اور ایک کُرسی پر بٹھا پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوُچھا: "تم نے یہ عجیب لباس کیوں پہن رکھا ہے؟"

"اس میں کون سی چیز عجیب ہے؟"

اس نے دوستانہ لہجے میں کہا: "خفا ہونے کی بات نہیں"

ایسی انوکھی عورت پر بھلا کیسے غصّہ آسکتا تھا۔

ڈھیل مرد سگریٹ ہاتھ میں لیے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ میں نے آنکھ سے اس کی طرف اشارہ کرکے پوُچھا:

"یہ آپ کے ابّا جان ہیں یا بھائی جان؟"

مرد نے قطعیت کے ساتھ کہا: "شوہر"

عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی : "یہ کیوں پوچھا ؟"
اسے غور سے دیکھتے ہوئے مَیں نے جواب دیا : "معاف کیجیے گا"
اس قسم کی ٹوٹی پھوٹی گفتگو کا سلسلہ پانچ منٹ جاری رہا۔
لیکن اگر کوئی کہتا کہ اس عورت کی مُسکراتی ہوئی آنکھوں اور نرم نرم خدوخال کو پانچ گھنٹے نہیں بلکہ پانچ سال بیٹھے تاکا کرو تو بھی مَیں اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ اُوپر کا ہونٹ پتلا اور نچلا گدرایا ہُوا۔ گھنے بال اس طرح ترشے ہوئے گویا سر پر ٹوپی پہنی ہوئی ہو۔ ایک آدھ لٹ گُلابی کانوں یا نازک گالوں پر جھُولتی ہوئی، بازُو مرمریں وسیمیں تھے اور ان کی ایک جھلک مَیں نے اس وقت دیکھی تھی جب وہ دروازے پر میرے مقابل کھڑی ہوئی تھی۔ مگر وہ سفید اور صوفیانہ کپڑوں میں ملبُوس تھی تاہم ان میں نفاست کا پہلوُ تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بلا کی موہنی تھی۔ ان میں ملائمیت اور مسرّت کے ساتھ ایک عجیب دِل رُبائی تھی۔ اور کچھ ہو نہ ہو، ایک بات ضرُور تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں وہ خاص کشش تھی جو ایک ایسے بیس سالہ نوجوان کے لیے ازبس ضرُوری تھی جس کا دِل زمانے کے ظالم ہاتھوں سے ستایا ہوُا ہو۔
اپنی ڈاڑھی میں دھنّویں کے چھلّے ڈالتے ہوئے شوہر نے کہا:۔
"زرا دیر میں بارش ہونے والی ہے"
مَیں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو آسمان پر بادلوں کا نشان تک نہ تھا اور تارے جگ مگ کر رہے تھے لیکن مَیں سمجھ گیا کہ وظیفۂ شوہریت میں مخل ہو رہا ہوں۔ واپسی کے وقت دِل اِس خیال سے باغ باغ تھا کہ بالآخر وہ چیز مِل ہی گئی جس کی تلاش لاعلمی میں برسوں سے کرتا رہا تھا۔

رات بھر اُن حسین آنکھوں کے تصوّر کو دِل میں چھپائے مَیں میدانوں میں پھرتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے مجھے یقینِ کُلّی ہوگیا کہ اس ڈڑھیل باگڑبلّے کو کوئی حق نہیں کہ اس نازک اندام کو اپنی بیوی بناکر رکھے۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اس بے چاری کے حالِ زار پر ترس آنے لگا۔ کتنی بدنصیب ہے کہ ایک ایسے مرد کے ساتھ رہنے پر مجبور ہے جس کی ڈاڑھی میں روٹی کے بھورے چھپے رہتے ہیں۔۔۔

دُوسرے دن ہم سب دریائے اوکا کی سیر کر رہے تھے۔ حضرتِ آدم کی پیدائش کے بعد دُنیا نے ایسا سہانا دِن نہ دیکھا ہوگا۔ نیلے آکاش پر سوُرج جگمگا رہا تھا اور ہَوا میں نئی کلیوں کی بھینی مہک بسی ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی کی سب لوگ اتنی تعریف کرنے لگے کہ میرا دِل ان کی محبّت سے لبریز ہوگیا۔ وہ کھوسٹ شوہر بھی چھپا رستم نکلا۔ وُہ اپنی بیوی سے الگ دوُسری کشتی میں بیٹھا تھا جسے مَیں چلا رہا تھا۔ دِن بھر وُہ ہنستا کھیلتا رہا۔ بہت سے لطیفے سُنانے کے بعد سیر بھر دوُدھ پی کر وہ پیڑوں کے جھرمٹ میں لیٹ رہا اور شام تک گہری نیند سوتا رہا۔

جشن کے لیے جو جگہ مقرّر کی گئی تھی وہاں سب سے پہلے میری کشتی پہنچ گئی۔ جب اپنی دِل کی رانی کو مَیں نے گود میں لے کر کشتی سے اُتارا تو وہ بولی:-

"تم میں اتنی طاقت کہاں سے آئی؟"

مَیں ایسے جوش میں تھا کہ سدِّ سکندری کو توڑ کر رکھ دیتا اور اِسی جوش میں ڈینگ ہانکنے لگا کہ آپ کو گود میں اُٹھا کر شہر لے جاسکتا ہوں جس کی دوُری سات میل سے کم نہیں۔ اس کی آنکھیں یوُں چمک اُٹھیں

گویا مجھے پیار کرلیں گی۔ دِن بھر ان میں وہی نور چھلکا کیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ نور پاشی میرے ہی لیے ہے۔

ہمارا لگاؤ چند روز میں بہت گہرا ہوگیا۔ اس عورت کے لیے یہ عین نظری امر تھا جیسے پہلی مرتبہ ایک دِل چسپ جانور سے واسطہ پڑا ہو اور اس نوجوان کے لیے بھی جیسے آغوشِ یار کے سوا اب اور کہیں آرام نہ مِل سکتا ہو۔

مجھے یہ معلوم کرتے دیر نہ لگی کہ الھڑپن کے باوجود وہ عمر میں مجھ سے دس سال بڑی تھی۔ نواب زادیوں کے اسکول میں اس کی تعلیم ہوئی اور پھر شاہی باغ کے داروغہ سے منگنی ہوگئی۔ پیرس میں اس نے دایہ گری اور مصوری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد ازآں پتا چلا کہ اس کی ماں نے جو خود بھی دایہ تھی مجھے بطنِ مادر سے نکال کر اس زمین پر رکھ دیا تھا۔ یہ سُن کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی گویا قدرت نے پہلے ہی محبت کا پیش خیمہ تان دیا تھا۔

جلاوطنوں اور آوارگی پسندوں سے اسے خاصی شناسائی رہی تھی۔ اس کے علاوہ دیس بہ دیس کے شہروں میں اس نے مصیبت کے دِن کاٹے تھے۔ ان تجربوں نے اعلا تعلیم سے مِل کر اس کی شخصیت میں ایسی رنگینی پیدا کردی تھی جو بہ ذاتِ خود حد درجہ دِل چسپ تھی۔ وہ تتلی کی طرح چنچل تھی اور انسانوں کے کردار و کاروبار کو طفلانہ حیرت سے دیکھتی تھی۔ فرانسیسی گیت شوخی سے گاتی، سگریٹ بانکپن سے پیتی، اداکاری اور مصوری کو خوب جانتی اور کپڑوں کی تراش خراش میں کمال دِکھلاتی تھی۔ دایہ گری سے اسے اب کوئی رغبت نہ تھی۔ کہنے لگی کہ مَیں نے اب تک چار بچے جنوائے جن میں سے تین مرگئے۔

اس کے بعد ترقیٔ تولید کی تحریک سے اپنے بلا واسطہ تعلق کو اس

نے منقطع کر دیا۔ البتہ اِس ناگزیر مہم میں اس نے بالواسطہ جو حصّہ لیا تھا اس کا ثبوت اس کی اپنی چہار سالہ بیٹی تھی جس کا بھولا حُسن ابتدائی بہار کی یاد دِلاتا تھا۔

وُہ اپنا ذِکر یوُں کرتی گویا کسی ایسے غیر انسان کی بات کہ رہی ہو جس سے وُہ خوُب واقف ہو اور اب اس کی سنگت باعث کوفت ہوگئی ہو۔ اپنا ذِکر کرتے وقت اس کی آنکھوں میں کبھی حیا جاگ جاتی یعنی حیرت ہوتی کہ مَیں اپنا ذِکر کیوں کر رہی ہوں۔

اس کی نکتہ رسی اور ذہانت کو مَیں خوُب محسوُس کرتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ مہذّب و شایستہ ہو۔ انسانوں سے وہ شفیقانہ رواداری سے پیش آتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ مَیں جتنی عورتوں سے واقف تھا ان میں وُہ سب سے زیادہ دِلچسپ تھی۔ وہ جس الھڑپن سے باتیں کرتی اس پر مجھے تعجّب ہوتا تھا۔ میرے تمام انقلابی دوستوں کو جانتی تھی۔ لیکن اس کے عِلم کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ ہر چیز کو وہ ایک بے تعلق تماشائی کی طرح دیکھتی تھی اور اس رویے میں اس کُہنہ مشق کا انداز تھا جو بچّوں کو کھیلتے ہوئے دیکھے اور ہنس کر چُپ رہ جائے۔

اس کی قیام گاہ میں دو کمرے تھے۔ ایک باورچی خانہ جو طعام خانے کا بھی کام دیتا تھا، دوُسرا خواب گاہ۔ موچیوں کے لیے تو یہ مناسب جگہ تھی۔ لیکن ایسی عورت کے لیے جو ادَب و انقلاب کے مسکن پیرس میں کئی سال گزار چکی ہو یہ رہنے کی جگہ نہ تھی۔ غرض کہ اس حسین تصویر اور اس کے فریم میں کئی تضاد تھے جنھیں دیکھ دیکھ کر مَیں دِل میں کڑھتا

کرتا تھا۔ لیکن وہ خود اس ماحول سے بے نیاز تھی اور ہرگز کسی برہمی کا اظہار نہ کرتی تھی۔

دوپہر تک گھر کا کام ختم کر کے وہ تصویریں اور نقشے بنانے بیٹھ جاتی تھی۔ اور شام کے وقت میونسپل کمیٹی کے لیے اعداد و شمار جمع کرنے میں شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

کھلی ہوئی کھڑکی سے سڑک کی مٹی اُڑ کر اس کے سر اور میز پر گرتی تھی۔ راہ چلتوں کے سائے اس کے کاغذات پر منڈلایا کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنے کام کاج میں منہمک گائے جاتی تھی۔ اور جب گاتے گاتے تھک جاتی تو تنہا ناچنے لگتی یا اپنی بچی سے کھیلنے لگتی۔ گرد و پیش کی غلاظت کے باوجود اس کی نفاست میں فرق نہ آتا تھا۔

اس کا شوہر جس کا نام بول نلاف تھا کاہل الوجود لیکن نیک دل آدمی تھا۔ اسے پلنگ پر لیٹ کر ناول پڑھنے میں لطف آتا تھا۔ ڈیوما اس کا محبوب مصنف تھا۔ وہ زندگی کو سائنس کی عینک سے دیکھنے کا عادی تھا اور کھانے کے بعد یہ کہہ کر لیٹ جاتا کہ :۔

"معدے سے جسم کے مختلف اعضا تک غذا پہنچانے کا یہی طریقہ ہو کہ پوری طرح آرام کیا جائے۔"

ڈاڑھی سے روٹی کے بھوروں کو جھاڑے بغیر وہ پلنگ پر لیٹ کر ناول پڑھنے لگتا تھا۔ پھر دو گھنٹے تک ایک تال پر خرّاٹے لیتے ہوئے سوتا رہتا اور خرّاٹوں کے زور سے مونچھ کے بالوں میں ایسی ہلکی ہلکی جنبش ہوتی جیسے ان میں کوئی مہین سا کیڑا حرکت کر رہا ہو۔ اُٹھ کر سیر گشت کے لیے جاتے وقت وہ بیوی سے اس قسم کی فرمایش کرتا نہ

بھولتا :-

"براہِ کرم میری فہرست میں ان لوگوں کے نام درج کر دینا جو فلاں ضلع کے باشندے ہیں اور جن کے گھر میں کوئی مویشی نہیں ہے۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔" عام طور پر وہ آدھی رات سے پہلے نہ لوٹتا تھا۔

جب موسم بُرا ہوتا تو وہ کہیں نہ جاتا اور بچّی کو پڑھانے کی کوشش کرتا۔ یہ بچّی ایک ایسے حادثے کا انجام تھی جو محبّت کے دو واقعات کے دوران میں کسی وقت سرزد ہو گیا تھا۔

اس کی دھنواں دھار تقریروں کو سُن کر بیوی کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو جاتا تھا۔ لیکن اس مردِ خدا پر مطلق اثر نہ ہوتا کیوں کہ تقریر کے دوران میں اسے نیند آجاتی تھی۔ بچّی زرا دیر اس کی ریشمی ریش سے کھیل کر خود بھی سو جاتی تھی۔ ان خشک تقریروں کی بہ نسبت میری کہانیاں اسے کہیں زیادہ پسند تھیں اور اس لیے ہم دونوں میں بڑی چاہت ہو گئی تھی۔ اس کے منھ بولے باپ کو مجھ سے ایک یہ شکایت بھی تھی۔

گو عمر میں وہ مجھ سے دُگنا تھا مگر تجسّس میں مُرغی کے چوزے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ غپ شپ کا شوق تھا اور ایسی ڈینگیں مارتا گویا دیس بہ دیس کی تمام انقلابی تحریکوں کا راز داں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس معاملے میں وہ باخبر تھا کیوں کہ اس سے ملنے والوں کی شخصیت عموماً پُراسرار تھی۔

ایک روز ان کے گھر میں نے ایک نئی شکل دیکھی جو تیزی و طرّاری میں الف لیلہ کے حجّام سے کم نہ تھا۔ بول سلاف نے الگ لے جا کر کان میں کہا: "یہ شخص پیرس سے ایک اہم مشن پر آیا ہے۔

کورولینکو* سے اس کا ملنا ضروری ہے اور یہ ملاقات نہیں کرا سکتے ہو۔"

مَیں کورولینکو کے گھر پہنچا۔ لیکن اس سے پہلے وہ بازار میں اس اجنبی کو دیکھ چکا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ اس 'کاکا توے' سے ہرگز نہ ملے گا۔

بول سلاف نے کہا کہ یہ انقلاب کی توہین ہے اور دو روز تک مختلف اسالیب میں کورولینکو کو شکایت نامہ لکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ بعد میں یہ مسودے نذرِ آتش ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں رُوس کے کئی شہروں میں دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہونے لگیں اور معلوم ہوا کہ یہ پیرس کا انقلابی دراصل خفیہ پولیس کا جاسوس تھا۔

بہرحال میری محبوبہ کے شوہر کے نیک نیت ہونے میں شبہ نہیں۔ البتہ وہ جذبات سے جلد مغلوب ہو جاتا تھا اور علم کے بوجھ سے ہمیشہ دبا رہتا تھا۔ وہ خود بھی اعتراف کیا کرتا کہ: اہلِ علم کے لیے زندگی کا مقصد یہی ہے کہ علم کا انبار لگاتے رہیں اور نہایت غیر جانب داری سے یہ متاع عوام میں تقسیم کرتے جائیں۔

محبت بڑھتے بڑھتے مجھے درد و اذیّت دینے لگی۔ تہ خانے میں بیٹھے بیٹھے جب مَیں اپنی محبوبہ کو کام میں مصروف پاتا تو بے اختیار یہ خواہش ہوتی کہ اسے گود میں لے کر اس تنگ و تاریک کمرے سے نکل جاؤں۔ یہاں میز کرسی اور پلنگ نے سانس لینے کی بھی جگہ نہ چھوڑی تھی۔ کھڑکی

---

* انیسویں صدی کے اواخر کا مشہور روسی مصنّف جو بعد میں گورکی کا ادبی سرپرست بنا۔

سے باہر چلنے والوں کی ٹانگوں کی قطار دِکھائی پڑتی تھی۔ کبھی کوئی آوارہ کتا سر ڈال کر اندر جھانکنے لگتا اور باہر سے دھول کے آنے جانے کا سِلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ کام کرتے وقت وہ گاتی رہتی تھی اور بیچ بیچ میں پیاری پیاری آنکھوں سے مجھے ایک نظر دیکھ لیتی تھی۔ اب میں اس سے دیوانہ وار محبت کرنے لگا تھا اور اس کی حالت پر مجھے اِتنا ترس آتا کہ اکثر غم و غصّے سے بھرا رہتا تھا۔

وہ کہتی: "کچھ اپنا حال سناؤ"

میں اپنی رام کہانی شروع کر دیتا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ ٹوکتی:۔

"تم تو اور کسی کا حال کہنے لگے"

یہ سچ ہے کہ زبان کھولنے کے بعد میں خیالات کی بھول بھلیاں میں یوں کھو جاتا کہ اپنا ماضی یاد نہ رہتا تھا۔ میرے تاثرات اور مشاہدات کی نوعیّت ایسی تھی کہ انھیں دُہرانے کا ہیاؤ نہ ہوتا تھا۔ میں کیا اور کون تھا؟ یہ سوال میرے دل و دماغ کو بے چین کر دیتا تھا۔ زندگی سے میں اس لیے ناخوش تھا کہ اس نے خودکشی کی مضحکہ خیز کوشش کی طرف مجھے راغب کیا تھا۔ انسانوں کو سمجھنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کا وجود غلاظت وجہالت میں لتھڑا ہوا اور سرتاسر بے معنی تھا۔ میری حالت اس آدمی کی سی تھی جو تجسّس کے جذبے سے مغلوب ہو کر دُنیا کے تاریک ترین گوشوں میں پھر رہا ہو تاکہ کسی طرح رازِ حیات کا پتا چلا سکے۔ یہ جذبہ اس قدر شدید تھا کہ کبھی کبھی قتل کرنے کو جی چاہتا صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کے بعد مجھ پر کیا بیتے گی۔

میں ڈرتا تھا کہ کہیں اپنے ماضی کو زندہ کرنے بیٹھوں تو میری

محبوبہ کے آگے ایک مہیب انسان کی تصویر آجائے گی۔ اس کے جذبات و خیالات اس قدر اُلجھے ہوں گے کہ عجب نہیں وہ جانِ جہاں پریشان ہوکر مجھے اپنے التفات سے محروم کردے۔ مجھے اپنی تہذیب و تربیت کرنی تھی اور اس میں اس کے سوا کوئی دُوسرا میری مدد نہ کرسکتا تھا۔ مجھے یقینِ کامل تھا کہ اس کا دستِ کرم مجھے اپنی حقیقت سے آشنا کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ اس کا نور مجھے اپنے مہیب ماضی کی قید سے آزاد کردے گا اور اس کے بعد میرے دِل سے غم کا سایہ ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ شادمانی و کامرانی کا اُجالا پھیل جائے گا۔

وُہ جس لاپروائی سے اپنا ذِکر کرتی اور دُوسروں سے جو بےنیازی برتتی اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ اس کا عِلم اتھاہ ہو۔ زندگی کی اُلجھنوں کو سُلجھانے کا اس کا اپنا طریقہ تھا اور اسی وجہ سے اس کی طبیعت پر کوئی بار نہ رہتا تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جسے سمجھنا میرے لیے ناممکن تھا اور شاید اسی لیے مَیں اس پر سو جان سے مرتا تھا۔ میری محبت میں جوانی کی ساری گرمی سموئی ہوئی تھی۔ اپنے جذبات کو ضبط کرنا مشکل تھا۔ اس کی قربت مجھ پر آگ کا کام کرتی اور میرا کس بل چوس لیتی تھی۔ اگر میری شخصیت میں عام جانوروں کا سیدھاپن ہوتا تو بہتر ہوتا لیکن میرا ایمان تھا کہ زن و مرد کے تعلقات کی واحد بنیاد ہم صحبتی نہ ہونا چاہیے کیوں کہ اس میں کوئی حُسن نہیں بلکہ گھنوناپن ہو۔ گو مَیں جوان بھی تھا اور تن دُرست بھی لیکن ہم صحبتی سے مجھے گھِن سی آتی تھی۔

خبر نہیں کہ رومانی محبت نے میرے دِل کو کیسے موہ لیا لیکن

مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میرے علم کے پردے کوئی ایسی حقیقت ہی جس سے میں ناآشنا ہوں اور اسی حقیقت میں عورت کے پیار کا جوہر پنہاں ہی۔ میں سوچتا تھا کہ عورت کے جسم سے پہلی مرتبہ واقف ہونے کے بعد مرد کوئی ایسی مسرت محسوس کرتا ہی جو اسے ایک نئے سانچے میں ڈھال دیتی ہی۔

یہ تصور ناولوں کے مطالعے نے پیدا نہیں کیا تھا۔ بلکہ حقیقی زندگی سے بیزار ہوکر میں نے اس قسم کے خیالات کی پرورش کی تھی۔ میں دُنیا میں اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ اس کی فرماں برداری کروں۔

مزید برآں ایک موہوم سی یاد جو حقیقت سے دُور اور عہدِ طفلی کے دھندلکے میں کھوئی ہوئی تھی یہ سمجھاتی کہ بہت پہلے میرے دماغ نے کوئی گہرا صدمہ برداشت کیا ہی یا سورج کی پہلی کرن سے بھی زیادہ مسرت خیز شی کا نظارہ کیا ہی۔ شاید یہ واقعہ اس زمانے میں ہوا ہو جب میں ہنوز بطنِ مادر میں خوابیدہ تھا۔ ممکن ہی میری ماں نے کوئی ایسی خوشی محسوس کی ہو جو میری رُوح میں رس بس گئی۔ وہ انوکھی مسرت میرے خون میں چُپکے چُپکے ناچتی رہی اور اس گھڑی کا بےتابی سے انتظار کرتی رہی جب کوئی عورت اسے ظاہر ہونے کا موقع دے۔

مرد کی ساری سوجھ بوجھ کا نچوڑ وہ علم ہی جو اسے عورت کے عشق اور اس کے حُسن کی پرستش کی طرف لے جاتا ہی۔ کیوں کہ عورت کے پیار نے ہی دُنیا کے سارے حُسن کو جنم دیا ہی۔

ایک دِن نہانے کے ارادے سے میں بجرے سے جو ندی میں کودا تو سینہ لنگر کی فولادی زنجیر سے ٹکرا گیا اور ٹانگیں یوں پھنس گئیں

کہ میں پانی میں اُلٹا لٹک گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ایک گاڑی بان نے باہر نکال کر ایسے جھٹکے دِیے کہ پیٹ کا پانی منھ کی راہ نِکل گیا۔ مگر کم بخت نے ایسے بے ڈھنگے پن سے جھٹکے دِیے کہ جسم کی کھال جگہ جگہ سے چِیخ گئی۔ گلا اندر سے اتنا چِھل گیا کہ مَیں پلنگ پر پڑ جانے کو مجبور ہو گیا۔

وُہ مزاج پُرسی کے لیے آئی اور سرہانے بیٹھ گئی۔ حادثے کی تفصیل سُنتے وقت وہ میرا سر دبانے لگی اور پریشان نگاہوں سے مجھے تاکنے لگی۔

مَیں نے پُوچھا کہ کیا تُم میری محبّت کو محسُوس نہیں کر سکتیں۔ جواب مِلا: "کیوں نہیں۔ لیکن یہ اچھّی بات نہیں کیوں کہ مَیں بھی تُمھیں پیار کرنے لگی ہوں۔"

فطری امر تھا کہ اس کی زبان سے یہ جُملہ نکلتے ہی میرے جہان میں زلزلہ سا آگیا اور در و دیوار رقص کرنے لگے۔ مجھ پر حیرت و مسرّت کا ایسا عالَم طاری ہوا گویا سکتہ ہو گیا۔ اس کی گود میں اپنا سر رکھ کر مَیں نے اس کی کمر تھام لی اور اگر ایسا نہ کرتا تو شاید صابن کے بُلبلے کی طرح اُڑ کر باہر چلا جاتا۔

میرا سر تکیے پر رکھتے ہوئے اس نے سختی سے کہا: "ہلنا جلنا تمھارے لیے بُرا ہے۔ اور اگر تم مشتعل ہوئے تو مَیں ابھی چلی جاؤں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ تُم بڑے بدھو ہو۔ میرے خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ دُنیا میں ایسے لوگوں کی بھی سمائی ہو سکتی ہے۔ خیر جب تم تن درست ہو جاؤ گے تو ہم اپنے معاملے پر غور کریں گے۔"

یہ باتیں اس نے نہایت سنجیدہ و متین لہجے میں کہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ چلی گئی تو مَیں امیدوں کے طلسم میں کھو گیا اور اس خیال سے نہال ہو گیا کہ اس کی مدد سے اُڑ کر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاؤں گا جہاں خیالات و جذبات مختلف ہوتے ہیں۔

چند روز بعد ہم دونوں ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دھان کی بالیاں سرہلا رہی تھیں اور بادل کہتے تھے کہ برس کر رہیں گے اس نے صاف الفاظ میں سمجھایا کہ ہماری عمر میں بڑا فرق ہے۔ تمھیں بہت کچھ سیکھنا ہے اور ابھی اس قابل نہیں کہ ایک عورت اور جہیز میں اس کی بچّی کا ذِمّہ لے سکو۔ افسوس کہ یہ سب حرف بہ حرف سچ تھا۔ اور وہ جس مادرانہ انداز میں یہ سب کہہ رہی تھی اس نے اس کی عزّت ومحبّت دوبالا کردی۔ اس کی آواز مجھ میں خوشی اور اُداسی کے متضاد جذبات پیدا کرنے لگی کیوں کہ پہلی مرتبہ کسی نے مجھ سے ایسی باتیں کی تھیں افق کی طرف دیکھتے دیکھتے مَیں نے دِل ہی دِل میں قسم کھائی کہ اس مہربانی کا بدلا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھوں گا۔

اس کی نرم آواز سرگوشی کر رہی تھی: "کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سب اونچ نیچ سوچ لینی چاہیے۔" دانتوں میں ایک تنکا چباتی ہوئی وہ شہر کی جانب دیکھ رہی تھی جو پیڑ پودوں کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔

وہ بولی: "مجھے اپنے شوہر سے بھی کہنا ہوگا۔ وہ چُپ چُپ سا رہنے لگا ہے اور شاید بھانپ گیا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مجھے بحث تکرار سے نفرت ہے۔"

ایک طرف تو شرافت کا یہ نظّارہ دیدنی تھا۔ مگر دُوسری طرف میرے ساتھ ایک ایسا مذاق ہورہا تھا جو محتاج بیان نہیں۔

میری پتلون کمر پر بہت ڈھیلی ہوتی تھی اس لیے مَیں نے تین انچ لمبی پِن سے اسے قمیص میں اٹکا دیا تھا۔ عاشقوں کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اب ایسی پِن نہیں بنائی جاتی۔ یوُں تو اس کی نوک برابر میری کھال میں زرا زرا چُبھ رہی تھی لیکن جب مَیں نے پینترا بدلا تو وہ پوُری کی پوُری گوشت کے اندر پیوست ہوگئی۔ محبوُبہ کی آنکھ بچاکر پِن تو مَیں نے نکال لی لیکن یہ دیکھ کر ہوش جاتے رہے کہ زخم سے خوُن کا فوّارہ نکل رہا ہے اور پتلون لہُولہان ہوئی جارہی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ خانساماں کے کوٹ کے نیچے نہ قمیص تھی نہ شلوکا۔ اب اس خونیں پتلوُن کو پہنے ہوئے چلا کیسے جائے گا؟

اس مضحکہ خیز حادثے نے میرے چھکے چھُڑا دیے اور گھبراہٹ میں ایسے لہجے میں باتیں کرنے لگا جیسے کوئی اداکار اپنا پارٹ بھوُل جائے۔

زرا دیر تو وہ دِل چسپی سے میری تقریر سُنتی رہی مگر پھر پیشانی پر بل آیا اور بولی: "کیا چرب زبانی ہے۔ تمھیں ہوکیا گیا، کبھی ایسی باتیں نہ کرتے تھے۔"

شرم کے مارے میرے لبوں پر مُہر لگ گئی۔

اس نے کہا: "اب چلنا چاہیے، کہیں بارش نہ ہونے لگے۔"

"مَیں تو یہیں ٹھیروں گا۔"

"کیوں؟"

میں بھلا کیا جواب دیتا۔
محبّت بھری نگاہوں سے مجھے گھور کر اس نے پوچھا: "خفا تو نہیں ہوگئے؟"
"کیسے ممکن ہے۔ مجھے خود پر غصّہ آرہا ہے۔"
کھڑی ہوتے ہوئے وہ کہنے لگی: "تم خواہ مخواہ کُڑھتے ہو۔"
میں تو خون کے حوض میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُٹھتا کیوں کر۔ چناں دِل ہی دِل میں دُعا مانگنے لگا کہ وہ چلی جائے۔
پیار محبّت کی کچھ باتیں کرکے وہ رخصت ہوئی اور میں حدِ نظر تک اس کے خرامِ ناز کو دیکھتا رہا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو یک بہ یک دِل میں وسوسہ اُٹھا کہ میری پہلی محبّت ناکام رہے گی
یہ وسوسہ صحیح ثابت ہوا۔ شوہر نے وہ ٹسوے بہائے اور رنج غم کا ایسا سوانگ بھرا کہ وہ بےچاری ششش و پنج میں پڑگئی۔
روتی ہوئی بولی: "تم تو ابھی جوان ہو لیکن وہ غریب کم زور او بے بس ہے۔ کہتا ہے کہ تم چلی جاؤگی تو میں دھوپ بغیر پھول کی طرح مر مرجاؤں گا۔"
اس کٹھن گھڑی میں بھی اس پھول کے تصوّر سے میں بے تحاشہ ہنس پڑا جس کی ٹانگیں چھوٹی، کولھے پچکے ہوئے اور توند اُبھری ہوئی تھی۔ اور اس کی ڈاڑھی میں مکھیوں کے لیے اتنا کھاجا جمع رہتا تھا کہ وہ مستقل طور پر اسی میں رہتی تھیں۔
مُسکرا کر بولی "تم تو مذاق کرتے ہو لیکن اس کے دِل پر بڑی چو لگی ہے۔"

"تو کیا میرا صدمہ کم ہی "

"تاہم تم ابھی جوان ہو مضبوط ہو —"

جہاں تک یاد پڑتا ہی آج پہلی مرتبہ کم زوروں سے مجھے نفرت ہوئی - بعد میں بھی یہی دیکھنے میں آیا کہ کم زوروں میں گھِر کر مضبوط لوگ بھی بے بس ہوجاتے ہیں - اور بے کار انسانوں کو سنبھالنے کی کوشش میں دِل و دماغ کی بہترین قوتیں ضائع ہوجاتی ہیں -

اس ناکامی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا. وحشت کے مارے اس شہر کو مَیں نے خیرباد کہا اور دو سال تک سارے روس کی خاک چھانتا رہا - اِس دوران میں مَیں نے کوہِ قاف ، کریمیا ، یوکرین اور قزاقستان کی بھی گرد چھانی اور نئے مشاہدات و تاثرات سے اپنے ذہن کو مالامال کیا - میری سختی اور تلخی بڑھتی گئی - گو ایسی عورتوں کو بھی دیکھنے کے موقع ملے جو میرے دِل کی رانی سے صورت و سیرت میں بہتر تھیں لیکن اس کا نقش میرے دِل سے کبھی نہ مِٹتا تھا اور اس کی یاد ذہن میں ہمیشہ تازہ تھی -

دو سال بعد خزاں کے موسم میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے مَیں طفلس جا پہنچا - وہاں کسی سے سُنا کہ وہ پیرس کی سَیر کر کے اسی شہر میں آئی ہوئی ہی - اور جب یہ سُنا کہ میری آمد کی خبر پر اس نے مسرّت کا اظہار کیا ہی تو اپنی جواں سالی اور سلامتِ صحت کے باوجود مَیں زندگی میں پہلی بار بے ہوش ہوگیا -

سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے مِلنے جاؤں نہ جاؤں کہ اس نے خود بعض دوستوں کے توسط سے مجھے یاد فرمایا -

وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین و دِل رُبا معلوم ہو رہی تھی۔ وہی بوٹا سا قد، وہی چمپئی رنگت، آنکھوں میں وہی گھلاوٹ۔ اس کا شوہر فرانس ہی میں ٹھہر گیا تھا اور وہ اپنی بچّی کے ساتھ طفلس میں اکیلی تھی۔

جب مَیں اس کے گھر پہنچا تو شہر میں آندھی اُمڈی ہوئی تھی۔ مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور پہاڑ پرسے دریا قیامت کا شور مچاتا ہوا نیچے چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ پُرشور ہواؤں اور بارش کے تریڑوں نے گھر کے در و دیوار کو دہلا رکھا تھا۔ ایک کمرے میں آگ دہک رہی تھی مگر ہر سُو افسردگی سی چھائی ہوئی تھی۔

ڈر کے مارے بچّی تو بستر میں دبک گئی تھی۔ لیکن ہم دونوں کھڑکی کے پاس کھڑے طوفان کا تماشا دیکھ رہے تھے اور معلوم نہیں کیوں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

میری محبوبہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا :۔

آج تک ایسا ہیبت ناک طوفان دیکھنے میں نہ آیا تھا۔"

پھر اچانک اس نے پوچھا : "اب تو محبّت کے روگ سے رہائی مِل گئی ہوگی ؟"

مَیں نے جواب دیا : "نہیں۔ آج بھی مَیں تُم سے ویسی ہی محبّت کرتا ہوں۔"

یہ سُن کر اسے بڑی حیرت ہوئی : "اللہ اللہ، تم کتنے بدل گئے، مشکل سے پہچانے جاتے ہو۔"

بجلی نے اس کی آنکھیں چوندھیا دیں اور وہ آرام کُرسی پر گِر پڑی "یہاں کئی لوگوں کی زبانی تمھارا ذِکر سُنا۔ سچ کہو، یہاں آنے کی اصل

وجہ کیا تھی ۔"

الٰہی ، وہ کس قدر سادہ و معصوم تھی ۔

آدھی رات تک اسے مَیں اپنی داستان سُناتا رہا ۔ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج ہمیشہ میرے تخیّل کو گرماتی ہی اور ان کی ندا میرے سوئے ہوئے دِل کے لیے ناقوس کا کام کرتی ہی ۔ وہ جس انہماک سے میری باتیں سُن رہی تھی اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ میری گفتار کا انداز پسندیدہ تھا ۔

قسمت نے ازسرِ نَو مجھے اِس ہستی کے رُو بہ رُو لا کھڑا کیا جو میری نظر میں حوروں سے بڑھ کر تھی اور جس کے سوا کوئی میری خوشی کا ضامن نہ ہوسکتا تھا ۔ ہلکا نیلا لباس اس کے سڈول جسم کے بانک پن کو یوں اُبھار رہا تھا گویا وہ بادلوں میں لپٹی ہوئی ہو ۔ جب وہ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کہنے لگی تو اس کی گلابی اُنگلیاں ایسی خوب صورتی سے حرکت کرنے لگیں گویا کوئی وایولن کے ستاروں کو چھیڑ رہا ہو ۔ جی چاہا کہ ای کاش ... مجھے موت آجائے اور مَیں اسے اپنی رُوح میں یوں بسالوں کہ وہ اسے چھوڑکر کہیں نہ جاسکے ۔ میرے جسم کی ہر رگ تن رہی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دِل آنِ واحد میں پھٹ جائے گا ۔

میرا سب سے پہلا افسانہ ابھی ابھی شائع ہوا تھا ۔ اسے پڑھ کر سُنایا لیکن یاد نہیں کہ تعریف میں اس نے کیا کہا ۔ اسے حیرت ضرور ہوئی کیوں کہ وُہ بولی : " اچھا ، تم تو نثر بھی لکھنے لگے ۔"

گویا ماورا سے اس کی شیریں آواز نے پوچھا : " پچھلی ملاقات کے بعد مَیں تمھارے خیال سے کبھی غافل نہیں رہی ۔ یہ ساری سختیاں

کہیں میری وجہ سے تو تمھیں نہیں جھیلنی پڑیں ؟"

مَیں نے جواب میں کہا کہ ہر مصیبت اور تکلیف میں میرے لیے یہ تسکین کافی ہے کہ مَیں بھی اسی دُنیا میں سانس لیتا ہوں جسے تم نواز رہی ہو۔

"تم کتنے پیارے ہو۔"

اسے گلے لگانے کو دِلِ دیوانہ مچل رہا تھا۔ لیکن یہ جھجک بھی تھی کہ اگر اپنے دہقانی بازوؤں میں اسے بھینچوں تو کہیں اناڑی پن کی وجہ سے اس کی ہڈی پسلی نہ ٹوٹ جائے۔ اس لیے مَیں پیکرِ تصور بنا اس کے حضور میں کھڑا دِل کی دھڑکن کو گنتا رہا۔

میری زبان سے صرف یہ اُکھڑے ہوئے الفاظ نکلے :

"خدارا مجھے نہ چھوڑو ــــ میرے ساتھ رہو۔"

اس کے منھ سے جو ہنسی نکلی وہ شرمائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا نور جگمگایا اور دور چھٹک کر اس نے کہا :

"یہی ہوگا۔ فی الحال تم نزنی جاؤ اور مجھے یہیں چھوڑ دو۔ مَیں سب سوچ سمجھ کر تمھیں خط لکھوں گی ــــ"

کسی ناول کے ہیرو کی طرح سر کے اشارے سے سلام کر کے مَیں ہَوا میں اُڑتا ہُوا واپس چلا آیا۔

جاڑوں کے موسم میں دونوں ماں بیٹیاں میرے پاس نزنی چلی آئیں اب ذاتی تجربے سے اس ضرب المثل کی صداقت ثابت ہوئی کہ "مفلس کی شبِ وصال بھی مختصر ہوتی ہے۔"

کسی پادری کے باغ میں ایک غسل خانہ تھا جسے ہم نے تین رُوبل ماہانہ کرایے پر لے لیا۔ اصل کمرے کو تو ہم نے خواب گاہ اور

دیوان خانہ بنایا۔ ساتھ والے گودام کو میں نے اپنے کتب خانے کا اعزاز بخشا۔ یہ جگہ انسانوں کے رہنے کی نہ تھی۔ کیوں کہ در و دیوار سے پالا اور کُہرا چھن چھن کر اندر آتا تھا۔ رات کو کام کرتے وقت جتنے کپڑے پاس تھے پہن لیتا اور اُوپر ایک قالین بھی ڈال لیتا۔ اس کے باوجود مجھے سخت قسم کی گٹھیا ہوگئی۔ مجھے اپنی طاقت اور سکت پر بجا طور پر ناز تھا لیکن ان حالات میں ان کا بھی دیوالہ نکل گیا۔

بڑے کمرے میں سیلن نہ تھی۔ لیکن جب وہاں انگیٹھی روشن کی جاتی تو ہر طرف دھنواں ہی دھنواں بھر جاتا تھا۔ ہماری ننھی جو بے حد نازک مزاج تھی اکثر دردِ سر میں مبتلا رہنے لگی۔

موسم بہار میں ہماری رہائش گاہ پر کھٹملوں اور مکڑیوں نے دھاوا بول دیا۔ ماں بیٹیاں ان کے مارے تنگ آجاتیں اور مجھے آئے دن ان کے خلاف جہاد کا اعلان کرنا ہوتا تھا۔ ہماری کھڑکیاں گھنی بیلوں سے ڈھنکی رہتی تھیں اور شرابی پادری انھیں تراشنے کی بھی اجازت نہ دیتا تھا۔ چناں چہ کمرے میں کبھی دھوپ نہ آتی تھی۔

یہ نہیں کہ اس سے بہتر رہنے کی جگہ نہ مِل سکتی ہو۔ لیکن کئی مہینے سے پادری کو کرائے کی رقم ادا نہیں کی گئی تھی۔ اور چوں کہ وہ مجھے پسند کرنے لگا تھا لہٰذا جانے کی اجازت بھی نہ دیتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ: " تھوڑی مدّت میں یونھی رہنے کی عادت ہوجائے گی۔ ورنہ بقایا ادا کردو اور پھر ـــــ میری بلا سے انگلستان ہی چلے جاؤ۔"

انگریزوں سے اُسے نفرت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ " وہ

لوگ کاہل ہوتے ہیں۔ تاش کے ایک کھیل کے علاوہ انھوں نے آج تک کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کی۔ اور فنِ حرب سے تو وہ قطعاً ناواقف ہیں۔

یہ پادری ڈیل ڈول میں پورا دیوزاد تھا۔ گول مٹول لال لال منھ اور لمبی سی لال رنگ کی ڈاڑھی۔ شراب کے معاملے میں ایسا بلانوش کہ اب کلیسا میں نماز پڑھانے کے کام کا بھی نہ رہا تھا۔ ایک درزن کی محبت میں وہ پاگل ہوا جارہا تھا حالاں کہ شکل صورت میں یہ عورت پہاڑی کوّے سے ملتی ہوئی تھی۔

اس کی شرارتوں کا ذکر کرتے وقت پادری کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر ڈاڑھی کے بالوں کو بھگونے لگتے تھے۔

میرے الحاد نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ بحث کے دوران میں وہ اس قسم کی دلیل پیش کرکے میری روح کو پھسلایا کرتا تھا:

"آسمانی باپ کے بیٹے! یہ بھی تو سوچ کہ دین دار کروڑوں ہیں مگر ملحدوں کی تعداد چند ہزار بھی نہیں۔ سبب یہ ہو کہ انسانی روح مذہب کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتی جیسے مچھلی پانی سے باہر نہیں رہ سکتی۔ اب تو تمھارے پاس کوئی جواب نہ رہا —— خیر، آؤ، جامِ شراب میں اپنی خفت کو غرق کردو۔"

"مجھے گٹھیا ہوگئی ہو، اس لیے شراب پینا بند کردیا ہو۔"

"یہ تمھارے کُفر کی سزا ہو۔"

اس عورت کو ایسے سڑے ہوئے گھر میں رکھتے ہوئے میرا دِل پھٹتا تھا اور میں شرم سے عرق عرق ہوجاتا تھا۔ میرے افلاس کی یہ انتہا تھی کہ

اکثر نہ تو کھانے کے لیے گوشت پک سکتا تھا نہ اس کا مقدور تھا کہ بچّی کے لیے کوئی کھلونا خرید لاؤں۔ شرم کے مارے رات رات بھر مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ غربت سے ذاتی طور پر مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ لیکن ایسی تعلیم یافتہ اور شایستہ عورت کے لیے خصوصاً اس کی پیاری سی بچّی کے لیے یہ زندگی ذلیل ہی نہیں مہلک بھی تھی۔

راتوں کو جب مَیں قانونی درخواستوں کی نقل تیار کرتا یا افسانہ ـــ لکھنے بیٹھتا تو غصّے کے مارے ایک سانس میں دنیا کو، اپنے آپ کو اور محبّت کو کوسنے لگتا تھا۔

لیکن اس عورت کے اطوار میں اس ماں کا سا وقار تھا جو اپنے بیٹے پر زندگی کی تلخیوں کا راز ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ کبھی بھُولے سے بھی اس کی زبان پر کوئی لفظِ شکایت نہیں آیا۔ مصائب جتنے زیادہ ہوتے جاتے اس کی آواز میں اُتنی ہی دلیری اور تبسّم میں اُتنی ہی شیرینی آتی جاتی تھی۔

صبح سے لے کر شام تک وہ پادریوں کی تصویریں اور ضلع بورڈ کے لیے نقشے بنایا کرتی تھی۔ جب ان چیزوں کی مانگ ختم ہوجاتی تو محلّے کی عورتوں کے لیے پیرس کی طرز پر انواع و اقسام کی ٹوپیاں بنانے لگتی تھی۔ ان کے لیے مختلف اشیا کے کباڑ کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ ان ٹوپیوں میں مذاق کا کوئی نہ کوئی پہلوٗ ضرور پوشیدہ ہوتا تھا کیوں کہ جب کوئی ٹوپی ختم کرکے اسے جانچنے کے لیے سر پر رکھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو کبھی کبھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتی تھی۔ لیکن جو عورتیں یہ ٹوپیاں خریدتیں

ان پر اور ہی کچھ اثر ہوتا ۔ چڑیوں کے ان گھونسلوں کو سر پر رکھنے کے بعد ان کی چھاتیاں تن جاتی تھیں اور ان کے مزاج ہی نہ ملتے تھے ۔

اس زمانے میں مَیں ایک وکیل کی محرّری کرتا تھا۔ فرصت کے اوقات میں دو پیسے فی لائن کے حساب سے ایک مقامی اخبار کے لیے افسانے گھسیٹ دِیا کرتا تھا۔ شام کی چائے کے وقت اگر ہم دونوں اکیلے ہوتے تو میری بیوی زار الیکزینڈر دویم کے دل چسپ واقعات سُناتی ۔ ایک مرتبہ وہ اس کے اسکول کے معائنے کے لیے آیا اور نواب زادیوں میں کوئی ایسی مٹھائی بانٹی جسے کھاکر کئی لڑکیوں کو حمل ٹھیر گیا۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی حسینہ اسکول سے غائب ہوکر جنگلوں میں زار کے ساتھ شکار کھیلتی پھرتی تھی ۔ بعد ازآں راج دھانی میں کسی سے اس کی شادی ہوجاتی تھی ۔

پیرس کے حالات سُناتے وقت اس پر شوق و جوش کی ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی تھی ۔ مجھ پر ان کا نشہ شراب کا سا ہوتا اور مَیں اس کی مدح میں قصیدہ نظم کیا کرتا۔ کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ میری زندگی میں جو حُسن ہے وہ دراصل میرے عشق کا پرتو ہی ہے ۔

سب سے زیادہ لطف ان داستانوں میں آتا جو اس کے بیتے ہوئے رُومانوں سے تعلق رکھتی تھیں ۔ اس موضوع پر وہ ایسے کُھلے الفاظ میں بحث کرتی کہ کبھی کبھی مَیں شرم کے مارے بغلیں جھانکنے لگتا تھا۔ اس کا پہلا منگیتر ایک جرنل تھا۔ اس کا حلیہ بیان کرتے وقت وہ ایسے تیکھے الفاظ استعمال کرتی کہ توبہ ۔ ایک بار اس جرنل نے زار سے پہلے کسی جنگلی بھینسے پر گولی چلادی اور جب وہ بے دم ہوکر گر پڑا

تو پکارنے لگا:

"اعلا حضرت مجھے معاف فرمائیں"۔

اس کی گفتگو میں ہمیشہ درگزر کا وہ پہلو ہوتا جو بنی نوعِ انسان کے لیے اس کا نظریۂ حیات ہی۔ کبھی اس کا خلوص بیزاری کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا اور ایسے موقعوں پر اس کی آنکھوں میں جو خاص چمک آجاتی وہ حقارت کی پردہ... دار تھی۔

ایک روز اس نے کہا: "اگر کوئی روسی مرضِ عشق میں گرفتار ہو جائے تو اتنی بکواس کرتا ہی اور ایسی باتیں بناتا ہی کہ سُن کر کوفت ہونے لگتی ہی۔ محبت کرتے وقت بھی شائستگی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا صرف فرانسیسی مردوں ہی کو آتا ہی۔ محبت کو وہ لوگ دین و ایمان کے مرتبے پر پہنچا دیتے ہیں۔"

اس کے بعد بادلِ ناخواستہ مَیں اپنے سلوک میں زیادہ محتاط ہو گیا۔

فرانس کی عورتوں کے متعلق اس نے کہا:۔

"ان کے دِل گرم نہیں ہوتے۔ لیکن اس کا بدل طبیعت کی نفاست اور لطافت ہی۔ محبت کو انھوں نے ایک فن بنا دیا ہی۔"

ایسی باتیں وہ نہایت متین و سنجیدہ لہجے میں کہتی تھی۔ مجھے ان معلومات کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن بہ ہر حال یہ بھی ایک نوع کا علم تھا اور مَیں اس کی گفتگو غور سے سُنا کرتا تھا۔

چاندنی رات میں باغ کی بارہ دری میں بیٹھے بیٹھے اس نے کہا:۔

"روسی اور فرانسیسی عورتوں میں وہی فرق ہی جو پھل اور

اس کے رس میں ہوتا ہے۔"

اس میں بھی پھلوں کے رس کی خاصیت تھی۔ شادی کے چند روز بعد جب مَیں نے جنسی تعلقات پر اپنے رومانی خیالات ظاہر کیے تو اس کے تعجب کی حد نہ رہی۔ بھیگی ملگجی چاندنی میں میری گود سے سر اُٹھاکر اس نے پوچھا:۔

"مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟ کیا دراصل تمھاری یہی رائے ہے؟"

اس کا گُلابی بدن بلور کی طرح شفاف تھا اور اس میں سے بُھنے ہوئے باداموں کی سی مہک آ رہی تھی۔ اس کی نرم و نازک انگلیاں غور و فکر کے عالم میں میرے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ اس کی پریشان نگاہیں مجھے گھورنے لگیں۔ اور لبوں پر جو تبسّم آیا اس میں بے اعتباری کا شائبہ تھا۔

"اوفوہ!" یہ کہہ کر وہ جھپ سے اٹھی اور سوچ بچار میں کمرے میں یوں چہل قدمی کرنے لگی کہ اب اندھیرے میں تو اب اُجالے میں اور اس کا جسمِ نازک چاندنی میں نہانے لگا۔ پاس آکر اس نے ہتیلی سے میرے گالوں کو تھپتھپایا اور مادرانہ شفقت سے کہا:۔

"تمھیں پہلی محبت کسی دوشیزہ سے کرنا چاہیے تھا۔ مَیں اس قابل نہ تھی —"

جب مَیں نے اسے گود میں اُٹھا لیا تو وہ چُپکے چُپکے رونے لگی:۔

"تُم جانتے ہو کہ مَیں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ سچ جانو کہ تُمھارے ساتھ مجھے جیسی خوشی نصیب ہوئی وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ آج تک کسی مرد سے مَیں نے ایسی سچی اور بے لوث

محبت نہیں کی - اس کے باوجود محسوس ہوتا ہی کہ ہم نے غلطی کی۔ مَیں وہ عورت نہیں ہوں جس کی تمھیں ضرورت ہی - اور دراصل یہ میری غلطی ہی۔"

میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا - لیکن دل کی حرکت بند سی ہوگئی۔ اور اس خوف سے کہ وہ ایسی ہی باتیں نہ کرتی جائے مَیں نے اس کے لبوں کو اپنے بوسوں سے بند کر دیا - تاہم یہ حیرت خیز الفاظ میرے ذہن پر نقش ہوگئے - چند روز بعد اس نے آب دیدہ ہوکر اُداسی سے وہی بات دہرائی :-

"کاش میری عُمر کم ہوتی۔"

مجھے خوب یاد ہی کہ اس رات کو ہَوا تیز چل رہی تھی - پیڑوں کی شاخیں سر دھن رہی تھیں اور آتش دان کے اندر ہَوا سنسنا رہی تھی

جب ہمارے پاس چند رُپے جمع ہوتے تو دوستوں کو دعوت دیتے اور کھانے پینے کا بڑا شان دار انتظام کرتے تھے - میری بیوی خاصی چٹوری تھی اور رُوسی کھانے اسے جی سے بھاتے تھے۔

اس نے ایک پیٹو کلب قائم کر رکھا تھا جس کے ارکان کی تعداد دس بارہ ہوگی - ان سب کو کھانے پینے کا شوق تو تھا ہی، یوں وہ فنِ طباخی کے ماہر بھی تھے اور گھنٹوں ان چیزوں پر بحث کرتے رہتے تھے - مجھے نہ تو اِس عِلم کی ضرورت تھی اور نہ کھانے کا خاص شوق تھا - چناں چہ مَیں نے نکتہ چینی کی کہ :-

"ہر پیٹو کے دماغ میں بھُس بھرا ہوتا ہی۔"

جواب میں وہ بولی : "ذرا ٹٹول کر دیکھو تو ہر آدمی کا دماغ

خالی نظر آئے گا۔ جرمن شاعر ہائنے نے ٹھیک کہا ہے کہ لباس کے اندر سب ننگے ہوتے ہیں۔"

اسے کئی ادبی اقوال یاد تھے لیکن ان کا برمحل استعمال نہ کرسکتی تھی مردوں کو مشتعل کرنے میں اسے بڑا لطف آتا تھا اور یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ اتنی چنچل اور گرم گفتار تھی کہ آن کی آن میں رونقِ محفل بن کر مردوں کے جذبات کو کریدنے لگتی تھی۔ جو بھی اس سے ذرا دیر بات کرتا گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا جاتا اور بعد میں اسے ایسی حریصانہ نگاہوں سے گھورنے لگتا جیسے بکرا بند گوبھی کو دیکھ رہا ہو۔

ایک بگڑے ہوئے رئیس نے جو ان دنوں توند کو گنبد بنائے وکالت کی کوشش کر رہا تھا فیصلہ کیا کہ: "یہ عورت نہیں مقناطیس ہے۔"

کسی وکیل کا منشی اس کی مدح و ثنا میں نظمیں لکھ کر بھیجا کرتا تھا۔ انھیں پڑھ کر مجھے کوفت ہوتی لیکن وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔

میں نے پوچھا: "تم ان کے جذبات کو ابھارتی کیوں ہو؟"

"چھیڑ چھاڑ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔" پھر وہ مسکرا کر پوچھتی کہ تم رشک تو نہیں کرنے لگے۔

بھلا مجھے کیا پڑی تھی کہ کسی سے جلتا۔ البتہ میرے سکون میں تھوڑا سا فرق آتا تھا کیوں کہ بھونڈے قسم کے آدمیوں سے مل کر مجھے کوفت ہوتی تھی۔ یوں میں ہنس مکھ تھا اور ہنسی کھیل کو زندگی کی چاشنی سمجھتا تھا۔ لیکن سرکس یا ناٹک کے مسخروں کو میں فضول

سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں ان سے بہتر طریقے سے دل لگی کا سامان مہیا کر سکتا ہوں۔ اکثر میں اپنے مہمانوں کو ہنساتے ہنساتے لوٹ پوٹ کر دیتا تھا۔

میری بیوی تعریف کے پُل باندھ دیتی: "تم ناٹک میں حصّہ کیوں نہیں لیتے۔ سوانگ بھرنے میں کوئی تمھارا مقابلہ نہ کر سکے گا۔"

شوقیہ ناٹکوں میں وہ جب کبھی پارٹ لیتی تو اپنے کو اس فن میں کامل ثابت کرتی اور اچھّے اچھّے اداآموز اسے یہ پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔

وہ اکثر مجھے ٹوکا کرتی کہ ہر امر کو فلسفے کی عینک سے دیکھنا مناسب نہیں: "زندگی بہت سیدھی سادی ہے۔ اسے معمّا بنا لینے ہی سے ساری اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ علم کا مقصد یہی ہے کہ زندگی کی اونچ نیچ کو ہموار کیا جائے۔ اس سے زیادہ کی کوشش بے سود ہے۔"

مجھے محسوس ہوا کہ اس کے نظریۂ حیات میں 'دایہ گری' کو بڑا دخل ہے۔ وہ خود بھی کہتی تھی کہ سائنس کی پہلی کتاب ختم کرنے کے بعد لڑکپن میں اس کے دماغ پر کیسا جھٹکا سا لگا تھا: "ایسا معلوم ہُوا کہ کسی نے کھینچ کر سر پہ پتّھر دے مارا۔ یا کسی نے آسمان سے زمین پر پھینک دیا۔ جو پُرانے عقائد علم کی روشنی میں غلط ثابت ہوئے تھے ان کی بے چارگی پر مجھے رونا آنے لگا۔ تاہم اب میں جس زمین پر کھڑی ہوں وہ سخت سہی مگر پائدار ہوا نہیں۔ خصوصاً خدا پر مجھے سب سے زیادہ ترس آیا۔ اسے پہلے میں رگِ جاں سے بھی قریب محسوس کرتی تھی۔ لیکن وہ سگریٹ کے دھوئیں کی طرح غائب ہو گیا۔

اور اپنے ساتھ آسمانِ محبت کے خوابوں کو بھی لے گیا۔ اسکول کی لڑکیاں محبت پر ایسی پُرلطف باتیں کیا کرتی تھیں کہ کوئی بیٹھا سُنا کرے۔"

اسکول کی تعلیم اور پیرس کی تربیت نے اس میں نفی اور تشکیک کے جو رجحانات پیدا کردیے تھے ان کا مجھ پر بھی بُرا اثر ہورہا تھا۔ راتوں کو کام کرتے کرتے اُٹھ کر میں اس کے پلنگ کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ عالمِ خواب میں وہ زیادہ نازک وحسین معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھتے وقت میرے دِل کو اِس خیال سے انتہائی تکلیف ہوتی تھی کہ اس کی رُوح زخمی اور ماتمی سوگوار ہے۔ رحم کے اس جذبے سے میرے عشق کی جلا ہوتی تھی۔

ہمارے ادَبی ذوق میں بُعدِ مشرقین تھا۔ اس کے باوجود ہمارے اخلاص میں کمی نہ ہوئی۔ نہ تو گرمیِٔ دِل کم ہوئی نہ ایک دُوسرے سے ہماری دِلچسپی میں فرق آیا۔ البتہ دو سال بعد مجھے اپنے تعلقات میں ایک قسم کی بے نمکی محسُوس ہوئی اور وقت کے ساتھ اس احساس میں زیادتی ہوتی گئی۔ میرے مطالعے اور ادَبی سرگرمی میں نمایاں اضافہ ہوگیا تھا لیکن مہمانوں کی بھیڑ بھاڑ سے برابر خلل ہوتا رہتا تھا۔ ان کی بے ذوقی وبالِ جان تھی لیکن ان کی تعداد بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہماری آمدنی زیادہ ہوگئی تھی اور اب ہم بالعموم دعوتیں دے سکتے تھے۔

میری بیوی کی زندگی ایک قسم کی نمایش تھی۔ لیکن ملاقاتیوں کے لیے میل جول کی کوئی حد متعین کرنا مشکل تھا۔ اپنی شوخی میں وہ کبھی ان سے ایسی قرابت داری برتتی کہ وہ بھی کھل کھیلتے اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ میرا فرض قرار پاتا۔ ایسے موقعوں پر میں دُنیاداری یا ضبط کے مظاہرے سے اپنے کو قطعاً عاری پاتا تھا۔

ایک ایسے ہی ملاقاتی کی مَیں نے ایسی گوش مالی کی کہ وہ بلبلاکر کہنے لگا: "مانا کہ غلطی میری تھی لیکن کیا مَیں کوئی بچّہ تھا جو میرے کان پکڑے۔ مار لیا ہوتا تو شکایت نہ ہوتی۔ لیکن عمر میں مَیں اس لونڈے کے باپ کے برابر ہوں۔ کان پکڑ کر اس نے بڑی توہین کی۔"

ظاہر ہے کہ خود پسندی کی نسبت سے سزا دینے کا طریقہ مجھے نہ آتا تھا۔

بیوی کو میرے افسانوں سے خاص دِل چسپی نہ تھی اور مجھے شاید ہی کبھی یہ بات ناگوار گزری ہو۔ اکثر میری رُوح پر الہامی کیفیت طاری ہوجاتی لیکن اس زمانے میں مجھے ہرگز یقین نہ ہوسکتا تھا کہ آگے چل کر تصنیف و تالیف ہی میری زندگی کا واحد مقصد قرار پائے گا۔ اخباری مشاغل کو بھی مَیں روزی کمانے ہی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

ایک صبح مَیں بیوی کو کوئی افسانہ سُنانے لگا جو رات کو لکھا گیا تھا۔ لیکن نظر پھیر کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سوگئی ہے۔ اس وقت مجھے بُرا نہ معلوم ہوا بلکہ کاپی بند کر کے اسے دیکھتے ہوئے کسی خیال میں محو ہوگیا۔ اس کا منھ زرا سا کھُلا ہوا تھا اور سر کرسی کے ہتّے پر ڈھلک گیا تھا۔ اس کی سانس میں طفلانہ ہم واری و سکون تھا۔ سورج کی پہلی کرنیں اس کے جسم پر یوں بکھری ہوئی تھیں جیسے بہشتی پھول۔

یک بہ یک مجھے اس توہین کی شدّت کا احساس ہوا اور دبے پاؤں اُٹھ کر یہ سوچتا ہوا باغ میں چلا گیا کہ شاید میرے قلم میں کوئی جوہر نہیں۔

ساری زندگی مَیں نے عورتوں کو یا تو اس حال میں دیکھا کہ محنت، غلاظت اور جہالت کے بار سے دبی ہوئی ہیں یا ایک عامیانہ خود اطمینانی کے نشے میں مخمور ہیں۔ اس افسانے میں مَیں نے یہ دکھایا تھا کہ عورتوں

کو آزادی اور خوب صورتی کے لیے کوشاں ہونا چاہیے ۔ لیکن جو عورت دُ
یں میرے لیے سب سے زیادہ محبوب تھی اس افسانے کو سنتے وقت
خرّاٹے لینے لگی ۔

اس کی وجہ کیا تھی ؟ میرے دِل میں جو رباب بج رہا تھا کیا اس
کے تار اب تک نہ سلجھے تھے ۔

مجھے امید تھی کہ یہ عورت جو میرے لیے بہ یک وقت ماں اور
محبوبہ تھی مجھے کسی ایسے اِمرت سے سرشار کرے گی جو میری تخلیقی قوتوں
کو سرسبز کردے گا ۔ زندگی نے میری راہ میں جو کانٹے بوئے تھے انھیں
وہ کب چُن لے گی مجھے اس دن کا انتظار تھا ۔

یہ تیس سال پہلے کا واقعہ ہے اور اس کے خیال سے مجھے آج بھی
ہنسی آتی ہے ۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کسی کے سو جانے سے مجھے دِلی رنج
ہوا ۔ گو ہر آدمی کو حق ہے کہ جب اور جہاں جی چاہے سو جائے ۔

میری رائے تھی کہ ہنس کر غم کا ذِکر کرنے سے غم غلط ہو جاتا ہے ۔
مجھے شبہ ہونے لگا کہ کوئی غیر مرئی ہستی دُنیا کا گشت اس لیے لگا رہی ہے
کہ انسانوں کے دُکھ درد پر شادماں ہو ۔ شاید یہی سارے آلام کی بانی اور
خوشیوں کی دشمن ہے ۔ اسے میں اپنا جانی بیری سمجھنے لگا اور تہیہ کرلیا کہ
ہرگز اس کے بھرّے میں نہ آؤں گا !

گوتم بدھ کی سوانح حیات میں اس مقولے نے مجھے ازحد متاثر کیا
کہ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔ زندگی نے مجھے کامرانی و
سرفرازی تو عطا نہ کی تھی ۔ تاہم میرا خیال تھا کہ غم ایک حادثہ ہے اور اسے
قانونِ حیات نہیں سمجھنا چاہیے ۔ انھی دنوں ''مشرق کے مذاہب'' نامی

ضخیم کتاب نظر سے گزری۔ اس میں بھی یہ پڑھ کر سخت کوفت ہوئی کہ کائنات کے خمیر میں فنا کے سوا کچھ نہیں۔ مذہبی نظریوں کو بے مغز پاکر مجھے غصّہ آتا تھا کیوں کہ کبھی انھی سے میری تسکین ہوتی تھی۔ فلسفۂ غم سے مجھے ایسی چڑ ہوئی کہ کوئی المیہ ڈراما نہ پڑھا جاتا تھا نہ دیکھا جاتا تھا بلکہ میں ایسے ڈراموں کا خاکہ اُڑانے میں مشّاق ہوگیا تھا۔

اس طوُل کلامی سے یہ مُراد نہیں کہ خدا نہ خواستہ ہمارے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے اور بدمزگی کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔ اس فلسفے بازی سے مدّعا یہ تھا کہ آپ کو اپنی داخلی زندگی کی ایک جھلک دِکھلا سکوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری بیوی کو بھی لڑائی جھگڑے سے کوئی رغبت نہ تھی۔

اس کے باوجود وکیل کے منشی کی عشقیہ تک بندی رفتہ رفتہ اپنا رنگ جمانے لگی۔ یوُں وہ کم بخت خوش خط بھی تھا اور اپنی تحریروں کو کبھی شکردان میں کبھی کسی کتاب میں غرض جو چیز بھی ہاتھ آجاے اس میں چھپا دیتا تھا۔ اگر کوئی محبت نامہ میرے ہتّے چڑھ گیا تو میں یہ کہ کر بیوی کے سپرد کر دیتا کہ :-

"لو بھئی تمھارے دِل کا قلعہ توڑنے کے لیے ایک اور گولہ آیا۔"

شروع شروع میں کام دیو کے کاغذی تیروں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا اور ان طویل نظموں کو وہ میرے پاس بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی۔ وہ عموماً خود کو شاہیں سے اور محبوبہ کو مرغِ آبی سے تشبیہ دیا کرتا تھا اور یہ ہمارے مذاق کا خاص موضوع تھا۔

لیکن ایک روز اس اسیرِ بلا عاشق کی کوئی نئی نظم پڑھ کر وہ بول اٹھی :-

"مجھے تو اس موے پر رحم آنے لگا۔"

مجھے اس نکھٹّو پر کیوں رحم آنے لگا تھا۔ چناں چہ اس کے بعد بیوی

نے کوئی نظم مجھے نہ سنائی۔

یہ تنک بند عمر میں مجھ سے چار سال بڑا، جسم گٹھیلا، طبیعت کا خاموش، شراب کا عادی اور چپکنے میں جونک سے کم نہ تھا۔ چھٹی کے دن دوپہر کے دو بجے آتا اور رات کے دو بجے تک بُت بنا بیٹھا رہتا۔ میری طرح وہ بھی وکیل کا منشی تھا۔ اور ہم دونوں کی خبط الحواسی عدالت میں ضرب المثل تھی۔

اس کی بے حرکتی اور خاموشی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ طبعاً اس قدر دقت پسند ہو کہ آسانی سے جی نہیں بہلا سکتا۔ اور یہ دیکھ کر میرے غصّے کی انتہا نہ رہتی۔ شراب کی چسکی لگاتے لگاتے وہ نشے میں آجاتا تھا اور پھر زبان سے ہاں، نا کرنے کی بہ جائے ناک سے طنزیہ انداز میں خرخرایا کرتا تھا۔ میری چشمِ بینا کو تو اس شخص میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ اور وجہ شاید یہ تھی کہ کسی شوہر کو اس آدمی میں خوبی نظر نہیں آتی جو اس کی بیوی سے پینگ بڑھانے کا جتن کر رہا ہو۔

اس منشی کا کوئی رشتے دار امیر تھا اور ہر مہینے اسے سو رُپے وظیفہ دیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی۔ ہر اتوار کو وہ میری بیوی کا منھ بیٹھا کرتا۔ سال گرہ کے دن اسے ایک دیوار گھڑی نذر کی جس کی نوک پر ایک چغد بیٹھا افعی کو اپنا ناشتہ بنا رہا تھا۔

یہ گھڑی مجھے معمول سے سوا گھنٹہ پہلے بیدار کر دیا کرتی تھی۔

اب میری بیوی نے اس مرد کو چھیڑنا بند کر دیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک خاص نرمی سے پیش آنے لگی۔ جب کسی عورت کو خیال ہوتا ہو کہ اس نے کسی مرد کا دماغی توازن بگاڑ دیا ہو تو اس سے وہ ایسی ہی نرمی روا رکھتی ہو۔ جب مَیں نے پوچھا کہ اس رومان کا کیا انجام ہونا ہو تو جواب ملا:-

خبر نہیں، مَیں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ اس کی شخصیت کا جو حصّہ مُردہ ہوچکا ہو اسے جھنجھوڑ کر از سرِ نو زندہ کردُوں۔"

مجھے اس کی صداقت پر اعتبار تھا۔ سوتے ہوئے لوگوں کو جگانے میں اسے خاص مزا مِلتا تھا اور وہ ایسی کوششوں میں آسانی سے کام یاب ہوجاتی تھی۔ لیکن انسان کو جگانے میں یہ خطرہ بھی ہو کہ اس کی گہرائیوں میں چھپا ہوَا درندہ کہیں بیدار نہ ہوجائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے بعد میرے اِرد گِرد انسانوں کی بجائے بھالو اور سانڈ چکّر کاٹنے لگے۔

میری خانگی زندگی کے متعلق احباب پریشان کن روایتیں بیان کرنے لگے۔ لیکن جب مَیں نے تنبیہ کی کہ اس قِسم کی بکواس کا جواب مَیں مکّوں اور جوتیوں سے دوں گا تو وہ سب دم سادھ کر بیٹھ گئے۔

میری بیوی نے کہا: "یوں مشتعل ہونے سے تمھیں کیا ملے گا۔ جو بد زبان ہیں وہ اس سے بھی بدتر تہمتیں تراشنے لگیں گے۔ تم رشک و حسد تو نہیں کرنے لگے؟"

مجھ میں جوانی کی خود اعتمادی اتنی زیادہ تھی کہ رشک کا سوال ہی پیدا نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن کئی ایسے خیالات اور جذبات ہوتے ہیں جن کا ذِکر صِرف اس عورت سے کیا جاسکتا ہو جو دِل کی ملکہ ہو۔ اس سے دِل کا حال کہتے وقت انسان پر وہی وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہو جو خدا کے حضور میں آتے وقت۔ لہٰذا جب یہ خیال آتا کہ شاید وہ میرے دِل کی باتیں کسی غیر شخص کو سُناتی ہوگی تو کلیجے پر چوٹ سی لگتی تھی اور پھر ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ بے وفائی نہ کرے۔

یہ وسوسہ بھی اُٹھنے لگا کہ اس قِسم کی زندگی کہیں مجھے اپنے راستے

سے دُور نہ لے جائے۔ ادب کے سوا دُنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی مگر موجودہ حالات میں میرے لیے کام کرنا ناممکن تھا۔ زندگی نے شکوہ و شکایت کا سبق نہیں پڑھایا تھا، اس لیے سب دیکھ کر بھی مَیں خاموش رہ جاتا تھا۔ خدا کی نظر میں ممکن ہو کہ ہر خاکی گناہ گار ہو۔ لیکن انسان کے نزدیک اصل گناہ گار وہ تھے جو اخلاق کے بہروپ میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ اخلاق کے یہ خداوند نیک و بد کے شرعی نکاح کی اولاد تھے۔ کیوں کہ شادی کا مفہوم ہی یہ ہے کہ دو متضاد طبیعتوں کے انسان متحد ہوکر ایک فضول قسم کی سطحیت پیدا کریں۔

آخرکار مَیں نے اپنی بیوی سے کہا: "اگر مَیں یہاں سے چلا جاؤں تو مناسب ہوگا۔"

کچھ سوچ کر وہ بولی: "ہاں، مجھے خود بھی احساس ہے کہ یہ ماحول تمھارے لیے موزوں نہیں۔"

کچھ دیر ایک دُوسرے کا ہاتھ تھامے ہم اُداس اور خاموش بیٹھے رہے۔ چند روز بعد مَیں نے اس شہر کو خیرباد کہا۔ وہ کسی ناٹک منڈلی میں شامل ہوگئی۔ اور یوُں میری پہلی محبت ختم ہوگئی۔ انجام غم ناک تھا۔ لیکن اس داستان کے رُوح افزا ہونے میں شبہ نہیں۔

کئی سال پہلے اس خاتون کا انتقال ہوگیا۔

اس کی تعریف میں یہ کہوں گا کہ زندگی نے اسے جو کچھ دیا وہ اس کا بہترین استعمال کرسکتی تھی۔ اس کے لیے ہر روز آنے والی عید کا ندیم تھا۔ 'کل' کا دن اس کے تخیل میں ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کل جادو کے پھوُل کھلیں گے۔ کہیں سے اچھے اچھے دوست آئیں گے، عجیب و غریب

تماشے دیکھنے میں آئیں گے۔

مصائب کو وہ ہنس کر ٹال دیتی تھی اور ہمیشہ خوش آیند مستقبل کی منتظر رہتی تھی۔ دوستوں کو وہ عزیز تو نہ رکھتی تھی لیکن ان کے تجزیے میں اسے خاص لُطف آتا تھا۔ لوگوں کو جلانے اور للچانے میں اسے مزا ملتا تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ کھیل خطرے سے خالی نہیں۔

اس کا قول تھا کہ: "دُنیا پر بھوک اور شہوت کی حکم رانی ہے۔ لیکن فلسفہ سب سے بڑا عذاب ہے۔ زندہ رہنا ہے تو محبت کے لیے جیو۔ اور سب کچھ وہم ہے۔"

ہمارے دوستوں میں سرکاری بینک کا ایک کارندہ بھی تھا۔ اس کی چال ڈھال پر بگلے کا گمان ہوتا تھا۔ اچھوتے خیال یا چُبھتے ہوئے فقرے سے اسے چڑ تھی۔ کیوں کہ اس کی بندھی بندھائی ذہنیت کسی جدّت کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ وہ بات کرنے کا نہیں بلکہ فتوا صادر کرنے کا عادی تھا۔ کوئی نیا اعلان کرنے سے پہلے وہ پتلون کی شکن ٹھیک کرتا، مونچھ کے بال خم دار کرتا اور پھر بھاری بھرکم لہجے میں کہتا: "عورتیں خود پسند ہوتی ہیں" یا "یہ سائنس کا زمانہ ہے۔"

اس بگلا بھگت کو رخصت کر کے میری بیوی ہنستے ہوئے کہنے لگی: "دیکھو یہ کتنا بڑا احمق ہے۔ اس کی بات چیت، چال ڈھال غرض کہ سب کچھ احمقانہ ہے۔ اس نے حماقت میں کمال حاصل کرلیا اور یہی بات مجھے پسند ہے۔"

میں اس کی گردن اور گالوں کو سہلانے لگتا تھا کیوں کہ اسے یہ پسند تھا۔ آنکھیں بند کر کے بلّی کی طرح جسم سمیٹ کر وہ کہنے لگتی: "انسان

کتنے دِل چسپ ہوتے ہیں۔ مجھے تو ہر آدمی دِل چسپ معلوم ہوتا ہے۔ مَیں اس کی رُوح کے ہر گوشے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اس کے تجسّس کا وہی حال تھا جو کسی ایسے بچّے کا ہو جو ایک نئے مکان میں بھیج دیا جائے۔ لیکن انسانوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں اسے زیادہ کام یابی ہوتی تھی۔ بلکہ اس کی چھیڑ چھاڑ صرف ان کے شہوانی جذبات کو ہی بیدار کرتی تھی۔

اپنے جسم سے اسے محبّت تھی۔ آئینے کے سامنے عریاں ہوکر وہ حیرت سے پکار اُٹھتی: "عورت کا بدن کتنا سڈول اور حسین ہوتا ہے۔"

پھر ارشاد ہوتا کہ: "اچھے کپڑے پہن کر مجھ میں زیادہ عقل اور طاقت آجاتی ہے۔"

یہ سچ بھی تھا کیوں کہ لباس کے ساتھ اس کی حاضر جوابی اور ذہانت نکھر جاتی تھی۔ بلکہ آنکھوں کی چمک بھی تیز ہو جاتی تھی۔ گو اس کا لباس قیمتی نہ ہوتا تھا۔ تراش خراش ایسی انوکھی اور من بھاتی ہوتی کہ عورتیں آفریں کہنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ اس سے وہ سب جلتی تھیں اور انھیں اس امر کا افسوس تھا کہ سیکڑوں رُپیہ خرچ کرکے بھی وہ نفیس کپڑے تیار نہیں کرسکتیں۔

پہلی محبّت نے میری زندگی کے ایک رُخ کو روشن کیا لیکن ہم دونوں کے ذوق میں اتنا اختلاف تھا کہ مَیں دِل ہی دِل میں کُڑھنے لگا۔

سبب یہ تھا کہ دُنیا میرے لیے ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ میری آنکھیں ہمیشہ دیکھتیں اور میرا دماغ ہمیشہ سوچتا تھا۔ ہزارہا سوال مجھ سے جواب طلب کرتے اور مجھے مصروف رکھتے تھے۔ مگر زندگی کے

اس پہلو سے میری محبوبہ کو چنداں دِل چسپی نہ تھی۔

ایک دِن بازار میں پولیس کے جمع دار نے کسی بوڑھے یہودی کو دُکان سے مُولی چُرانے کے الزام میں پیٹ دیا۔ مَیں نے اس بوڑھے کو دیکھا کہ لہوُلہان خاک بہ سر آسمان کو اپنی پُرشوکت آنکھوں سے دیکھتا چُپ چاپ چلا جارہا ہے۔ آج تیس سال بعد بھی مَیں ان آنکھوں کے بے زبان شکوے کو نہیں بھول سکا۔ انسان پر جو ظلم ہوتے ہیں وہ فراموش نہیں کیے جا سکتے ——— اور نہ انھیں کبھی فراموش ہونا چاہیے!

بازار سے جب گھر لوٹا تو غم و غصّے کے مارے میری بُری حالت تھی۔ اس قِسم کے نظّاروں کا مجھ پر شدید اثر ہوتا تھا اور مَیں زندگی کی تلخ حقیقت کو بھول جاتا تھا۔ محسوس ہوتا کہ مَیں کوئی اجنبی ہوں جِسے سزا دینے کی خاطر دُنیا کی بے انصافیاں اور مظالم دکھلائے جارہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر صاف عیاں ہوجاتا کہ وہی ہستی جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے دراصل مجھ سے کِس قدر مختلف ہے۔

جب مَیں نے یہودی کی دُکھ بیتی سُنائی تو اس نے حیرت سے کہا:۔

"لیکن تُم کیوں پریشان ہو؟ اصل میں تو تمھارے اعصاب خراب ہورہے ہیں۔"

اسے مصائب کے ذِکر تک سے نفرت تھی۔ رحم و کرم کے تصوّر سے بھی وہ ناآشنا تھی اور اسے صِرف وہ لوگ پسند تھے جو ہنسنا

ہنسانا جانتے تھے۔

زندگی کے مسائل کو وہ تماشائی کے نقطۂ نظر سے دیکھتی تھی۔مد
اپنا سب سے بڑا کرتب آخر تک نہیں دِکھلاتا اور تماشائی کے تجسـ
ذوقِ تماشا کو آخری گھڑی تک برقرار رکھتا ہو۔

میری بیوی کا بھی یہی حال تھا۔ مجھے یقین ہو کہ مرتے دم بھی
اسے امّید ہوگی کہ موت کی حیثیت کسی شعبدے سے زیادہ نہیں اد
اس میں بھی دِل چسپی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور مضمر ہوگا!!

'ہماری زبان'

انجمنِ ترقیِّ اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہی

چندہ سالانہ ایک رُپیہ فی پرچہ ایک آنہ

'اُردو'

انجمنِ ترقیِّ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہی

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہی تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہی۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے کے قریب ہوتا ہی۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رُپے سکۂ انگریزی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

'معاشیات'

انجمنِ ترقیِّ اُردو (ہند) کا نیا ماہ نامہ

'معاشیات' میں علمِ معاشیات سے متعلق بلند پایہ مضامین اور مقالے شائع ہوتے ہیں اور ہندستان، غیر ممالک نیز بین الاقوامی دنیا کے معاشی مسائل اور حالاتِ حاضرہ پر سنجیدہ اور علمی انداز میں بحث کی جاتی ہی۔ قیمت سالانہ پانچ رُپے (صہ)

ملنے کا پتا: دفتر انجمن ترقیِّ اُردو [illegible]